فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ (قرآن)

[redacted]

مقامِ حدیث

حدیث کی دینی حیثیت کیا ہے؟ حدیثیں کس طرح بنیں اور کس طرح
ہم تک پہنچیں؟ حدیثوں کے سامنے قرآن کی پوزیشن کیا رہ گئی ہے؟
ان تمام مباحث پر تفصیلی گفتگو اور جامع معلومات۔ دو جلدوں میں۔

جلدِ اوّل

شائع کردہ

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

قیمت مجلد — چار روپے

۵۰۸۷
DATA ENTERED

فہرست مشمولات مقام حدیث

(جلد اوّل)

عنوان	صفحہ	عنوان
(۱) شخصیت پرستی (محترم پرویز صاحب)	۹	جمع حدیث
(۱) رسول پرستی	۱۱	حدیث کی صحیح حیثیت
ائمہ پرستی	۲۰	روایات بالمعنیٰ
قرآن اور عقل	۲۸	وضع حدیث
اسلاف پرستی	۳۱	ثقاہت کا فیصلہ
فرقہ پرستی	۳۲	داخلی شہادت
(۲) رواۃ پرستی	۳۶	دین ظنی نہیں ہوسکتا
قرآن اور حدیث	۳۸	رسول کی اطاعت
قرآن	۴۰	حدیث کی صحیح پوزیشن
سفر حدیث	۴۲	(۳) پیر پرستی

Marfat.com

عنوان	صفحہ
علم لدنی	۷۱
مرشد قرآن ہے	۷۶
مردہ پرستی	۷۸
ماضی پرستی	۷۹
حقائق پرستی	۸۲
آخری گذارش	۸۴
استدراک	۸۶
علم حدیث (علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری)	۹۷
روایت حدیث	۱۰۱
کتابت حدیث	۱۱۵
وضع حدیث	۱۲۲
تنقید حدیث	۱۳۶
اصول حدیث	۱۴۲
دلائل حدیث	۱۴۹
قرآن و حدیث	۱۵۶
عقل اور حدیث	۱۶۲
رتبہ حدیث	۱۶۶
حقیقت حدیث (علامہ اسلم جیراجپوری)	۱۶۹
حدیثیں ذہن کیونکر نہیں ؟	۱۷۱
موضوعات	۱۷۳
دو قسم کے شیاطین	۱۸۳
رفتار حدیث	۱۸۷
امام اعظمؒ	"
موطا	۱۹۰
قانون عام	۱۹۲
صحیح بخاری	۱۹۴
اختلافات	۱۹۸
خاتمہ	۲۰۱
(۵) وضع حدیث (علامہ حافظ محمد اسلم)	۲۰۲
عہد صحابہ	۲۰۳
زمانہ مابعد	۲۰۶
کثرت موضوعات	۲۱۲
کتب موضوعات	۲۱۳
تنقید حدیث	۲۱۵
موضوعات کا اثر	۲۱۹
موضوع صحابہ	۲۲۳

DATA ENTERED

Marfat.com

عنوان	صفحہ
(۶) شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث	۲۲۵
جمود و تعطل	۲۲۷
لیبل	۲۲۸
دلیل	۲۳۰
قرآن اور فقہ	۲۳۲
شانِ نزول	۲۳۳
عقل اور قرآن	۲۳۴
متشابہات	۲۳۶
ناسخ و منسوخ	۲۳۷
تفاسیر قرآن	۲۳۸
مکمل کتاب	۲۳۹
قرآن و سنت و اجماع	۲۴۱
قرآن اور حدیث	۲۴۶
صحاح ستہ میں غلط روایات کا اختلاط	۲۴۹
ضعیف روایات متواتر کیسے بن جاتی ہیں	۲۴۹

عنوان	صفحہ
صحیح بخاری کی ضعیف روایات	۲
صحیح اور ضعیف احادیث کا معیار	
صحیح بخاری کی بعض احادیث	
مرکزیت	۲
(۷) تین بڑے منکرین حدیث۔ امام ابوحنیفہؒ شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ	۵۴
(۸) ہمارا جرم	۹
قرآن کی مخالفت	۱
ہماری دعوت	۵
احادیث کی حیثیت	۹
تفسیری روایات	۱
ہمارا مسلک	۲
(۹) ایک خط	۴

Marfat.com

عنوان	صفحہ
تدوین حدیث عہد نبوت میں نہیں ہوئی۔	۲۸۵
بعض خاص صحیفے	۲۸۶
دوسری صدی ہجری یعنی عہد تابعین میں بھی نہیں ہوئی	۲۸۸
عہد بنی عباس میں تدوین حدیث کا آغاز	۲۸۹
وضع حدیث کی گرم بازاری	۲۹۳
وضاعین حدیث کے مختلف طبقے۔	"
اسباب وضع حدیث	۲۹۵
احادیث پر کن اصول سے تنقید کی جا سکتی ہے۔	۲۹۶
ہمارے مجموعہ ہائے احادیث حتیٰ کہ صحیح بخاری میں کیا ایسی روایتیں موجود ہیں جو درایۃً صحیح نہ ہوں؟	۲۹۸
حدیث مستقل تشریع نہیں	
بلکہ بیان و تفصیل وحی الٰہی ہے	۲۹۹
فروعی قوانین کی تدوین	۳۰۲
حدیث دراصل انسانیت کے ایک حیرتناک انقلاب کی تاریخ ہے اور بس۔	۳۰۴
حدیث کو تاریخ کہنا نئی بات نہیں ہے	۳۰۵
رسالہ معارف اور حدیث	۳۰۶
(۱۰) مسئلہ مغنہ	۳۰۹
دین کے بنیادی گوشے کے متعلق ایک اہم بحث	"
قرآن پر ایمان	۳۱۳
اتباع صرف قرآن کی ہے	۳۱۵
مودودی صاحب کا ارشاد	"
وحی اور غیر وحی کا فرق	۳۱۷
رسول ہر حال میں رسول تھے	۳۱۸
ایک اعتراض	۳۱۹
خداداد بصیرت	۳۲۳

Marfat.com

عنوان	صفحہ
وحی کی دو قسمیں	۳۲۶
ہر بات وحی نہیں ہوتی تھی	۳۳۱
وحی خفی قرآن میں کیوں نہ رکھ دی گئی؟	۳۴۱
وحی جلی اور وحی خفی میں تضاد	۳۴۰
حدیث شرح نہیں مستقل دین ہے	۳۵۲
حفاظتِ حدیث	۳۵۳
غلط احادیث	۳۵۵
جرح و تعدیل	۳۵۹
مزاج شناس	۳۶۲

عنوان	صفحہ
مزاج شناس کے اختیارات	[illegible]
خلاصۂ مبحث	[illegible]
مودودی صاحب کے تضادات	۴
مزاج شناسی	[illegible]
(۱۱) الہام (محترم پرویز صاحب)	[illegible]
الہام کیا ہے	[illegible]
الہام	۳
وحی	۰۵
وحی غیر انبیاء کی طرف	۰۹
یہ تفریق کیوں؟	۱۲
عبادت کا مفہوم	۱۵

بقایا مباحث

مقامِ حدیث۔ جلد دوم میں آگئے ہیں۔
ضخامت۔ چار سو سے زائد صفحات
قیمت مجلد۔ چار روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

بعض باتیں کچھ اس طرح مشہور ہو جاتی ہیں کہ لوگ انہیں بطور حقیقت ثابتہ ماننے لگ جاتے ہیں اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ انکے متعلق تحقیق کر کے دیکھ لیا جائے کہ انکی اصلیت کیا ہے۔ اس قسم روش، زندگی کے عام مسائل میں بھی مستحسن نہیں قرار پا سکتی لیکن دین کے معاملہ میں یہ انداز بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ لیے کہ جس بات کو ہم دینی قرار دیں اسکے متعلق ہمیں یقین ہونا چاہیئے کہ وہ فی الواقعہ دینی ہے۔ آپ کسی لمان سے پوچھئے۔ وہ بلا تامل کہدے گا کہ دین نام ہے "قرآن اور حدیث" کا۔ قرآن کے دین ہونے یں تو کوئی شبہ ہی نہیں خود خدا نے اسے دین کا ضابطہ قرار دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دیث بھی دین کا جزو ہے؟ یہ تھا وہ سوال جس پر غور کرنے کی دعوت طلوع اسلام نے دی۔ طلوع اسلام کہنا یہ تھا کہ اگر حدیثیں بھی دین کا جزو تھیں تو رسول اللہؐ کو چاہیئے تھا کہ جس طرح آپ نے امت کو قرآن تھا اسی طرح اپنی احادیث کا ایک مستند مجموعہ بھی امت کو دے جاتے۔ لیکن رسول اللہؐ نے ایسا نہیں کیا۔ وال یہ ہے کہ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ سوال خالص علمی اور دینی تھا اور اس پر بحث بھی اسی انداز سے نی چاہیئے تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے مذہب پرست طبقہ میں اتنا ضبط ہی نہیں کہ وہ دین کے مسائل پر جذبات الگ ہٹ کر گفتگو کر سکیں۔ اس لئے انہوں نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے طلوع اسلام کو منکر اور کافر بنانا شروع کر دیا۔ لیکن طلوع اسلام نے اس کے باوجود ان کے اعتراضات کا جواب دیا اور

Marfat.com

اپنے سوالات کو بار بار دہرایا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء سے اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس سلسلہ میں حدیثوں کے متعلق معلومات کا اس قدر ذخیرہ فراہم ہو گیا کہ ہر طرف سے تقاضے موصول ہونے لگے کہ ان تمام مباحث کو یکجا کر دیا جائے تاکہ اس سے عام فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ یہ گراں بہا ذخیرہ، چار چار سو صفحات کی دو جلدوں میں سمٹ کر آیا ہے۔ جن میں سے جلد اول پیش خدمت ہے اور جلد دوم عنقریب سامنے آجائے گی۔ ہماری درخواست صرف اس قدر ہے کہ آپ ان مباحث کا ٹھنڈے دل سے خالی الذہن ہو کر مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد، جس فیصلے پر آپ کی بصیرت آپ کو پہنچائے اسے قبول کر لیں۔ یہ دین کا سوال ہے آپ کا یا ہمارا نجی معاملہ نہیں۔ اس لئے اس سوال کی پوری اہمیت کو سامنے رکھ کر، نہایت متانت اور سنجیدگی سے اس پر غور فرمائیے۔ امید ہے کہ اس طرح آپ پر حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ طلوع اسلام نہ کسی فرقہ سے متعلق ہے اور نہ ہی (خدا نکردہ) کسی نئے مذہب کا داعی۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ دین کو اس کے اصلی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ خدا اسے کامیاب کر دے

والسلام

۲؍ دسمبر ۱۹۵۳ء

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

ہیثلی

یہ کتاب پڑھنے کے بعد "حقیقت حدیث" ضرور پڑھیں تاکہ ذہن صاف ہو جائے۔

*ضرور پڑھیے "حقیقت حدیث"

*مجھے یہ کتاب پڑھ کے یہ اندازہ ہو رہا ہے کس کتنا علم ہونا چاہیے ورنہ لوگ بہت آسانی سے گمراہ کر سکتے ہیں

شخصیت پرستی

١

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان براہِ راست تعلق پیدا کر دے۔ ایسا تعلق کہ عبد و معبود کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ اور ان کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو۔ اور اس طرح انسان، کہ جسے فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا، ساری دنیا کی غلامی سے نجات پاکر، صحیح معنوں میں آزادی حاصل کر لے۔ خدا اور بندے کا یہ براہِ راست تعلق، اللہ کی کتاب (قرآن) کی اطاعت سے قائم ہونا تھا۔ نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتا دیا کہ اس بلند ترین تخیل، اس زریں نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا مشن ان شاندار الفاظ میں بتایا گیا:-

اللہ کا ایمان محفوظ رکھے!

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝

کہو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ تمہارا الٰہ ایک ہی ہے پس اسی کی طرف سیدھی راہ اختیار کرو اور اس سے مغفرت (حفاظت کا سامان) مانگو۔ اور مشرکین کے لئے بڑی ہی خرابی ہے۔

اور اسی کی تفسیر تھی جو پیکرِ اسلام جناب عمرؓ نے وادی ضجنان میں گزرتے

Marfat.com

وقت فرمایا "اللہ اکبر! یہ وہ وادی ہے جس میں ابن خطاب اُونٹ چرایا کرتا تھا اور باپ کی سخت گیری برداشت کیا کرتا تھا اور آج اس رب العزت کا اتنا فضل ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہیں"۔ اس سے مُراد محض سلطنت و حکومت کی طاقت ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ طاقت جو انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہو کر اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حاجب و دربان بن جاتی ہے۔

لیکن ہر دقیق نظریہ کی طرح یہ نظریہ تھا بڑا لطیف اور ہر حقیقتِ عظمیٰ کی مانند یہ حقیقت تھی بڑی غیر محسوس۔ محسوسات کا خوگر انسان، کہ جس کے سجدہ ہائے جبینِ نیاز بسیط سے بسیط حقیقتِ مجردہ کو بھی لباسِ مجاز میں دیکھنے کے لئے رقصاں و جنباں رہتے ہیں۔ اس غیر محسوس تعلق سے زیادہ عرصہ تک کیف اندوز نہ ہو سکا اور اس نے وہ تمام پردے ایک ایک کر کے پھر سے گرا لیئے جو اسلام سے پیشتر اُس کے اور اُس کے خدا کے درمیان حائل تھے، اور جنھیں نبی عربی نے ایک ایک کر کے اٹھا دیا تھا۔ قرآن کریم نے بڑے شرح و بسط سے ان تمام مقامات کو ایک ایک کر کے گِنا دیا تھا جہاں سے یہ پردے قلب و دماغ اور سمع و بصر پر گرا کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک قرآن مجید آنکھوں کے سامنے رہا کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان پردوں کو پھر سامنے لا سکے کہ چراغ کا روشن ہونا ہی اس بات کیلئے کافی ہے کہ اندھیرا وہاں نہ آسکے لیکن

Marfat.com

جب قرآن مہجور ہوگیا، جب بنی اسرائیل کی طرح اس نورِ مبین کو پس پشت ڈال دیا گیا تو وہی کچھ ہوا جو ہوتا چلا آتا تھا کہ فطرت کے قوانین اٹل اور اس کا دستور غیر متبدّل ہے۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ آئیے ان مختلف پردوں اور ان کے حسین وجمیل نقش و نگار کو ایک نظر دیکھیں جو (خود ساختہ) عقیدت و ارادت کے رنگوں سے مزین اور (بزعم خویش) اطاعت ومتابعت کے جواہر سے مرصّع ہیں۔ اس لئے کہ جب تک آپ ان نظر فریب پردوں کی اصلیّت سے واقف نہ ہو جائیں گے اس حقیقتِ عظمیٰ تک نہیں پہنچ سکیں گے جو صدیوں سے اُن کے اندر لپٹی ہوتی ہے اور بے نقاب ہو کر جنّت نگاہ نہیں بن سکی۔

رسُول پرستی!

خدا کے بعد، ماننے والوں کے نزدیک، ہمیشہ رسول کی ہستی اشرف ترین مخلوق ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر انسانوں میں سے کسی کو خدا کی جگہ دی جاسکتی ہے تو سب سے پہلے وہ رسول ہی کی ہستی ہو سکتی ہے۔ اُمم سابقہ کی روش اس باب میں جو کچھ رہی ہے اس پر قرآن تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ انسانی طبیعت کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح حضرات انبیاء کرام خدا بنائے گئے یا اس کے بیٹے قرار دیئے گئے، اُنھیں الوہیت و ابنیت کی مقدس چادر اُڑھا کر مافوق البشر منوایا گیا۔ قرآن کریم اس خطرناک چور دروازہ کو

Marfat.com

کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے بند کرنا چاہتا تھا۔ آپ کسی سورت کو دیکھئے لفظاً، معناً، مجملاً، تفصیلاً اس غلط عقیدہ کے ہر گوشہ کی تردید اس میں موجود ہوگی یعنی قرآن کریم میں جس درجہ خدا کی توحید پر مختلف عنوانات سے زور دیا گیا ہے اسی درجہ رسولوں کی بشریت بھی متنوع اعتبارات سے بے نقاب کی گئی ہے۔ انھیں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا گیا۔ انھیں خدا کا عبد کہا گیا۔ وہ ہدایت بھی کرتے تھے تو اپنے مالک کے حکم سے ہی کرتے تھے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۳)

اور ہم نے ان کو امام و پیشوا بنایا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔ اور ہم نے ان کو نیکی کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ سب ہماری عبودیت اختیار کئے ہوتے تھے۔

وہ خود خدا کے دروازے کے بھکاری ہوتے تھے۔

فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸/۲۴)

اور موسیٰ نے کہا کہ پروردگار آپ جو کچھ بھی بہتری میرے لئے بھیجیں میں اس کا محتاج ہوں۔

انھیں اپنی ذات تک کے لئے نفع و نقصان کا اختیار نہ ہوتا تھا۔

تم کہہ دو کہ میں اپنی ذات کیلئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں

Marfat.com

رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب کے امور سے واقف ہوتا تو میں
بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔
میں تو صرف ایمان والوں کے لئے نذیر و بشیر ہوں۔ (۷/۱۸۸)

جو وحی ان پر نازل ہوتی تھی وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ اور اس کی اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح اور ماننے والے اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ ہر چند وہ اطاعت و انقیاد کے اس بلند مقام پر تھے کہ ان سے احکامِ الٰہیہ سے سرکشی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بایں ہمہ ان کی بشریت و عبودیت کو پختہ ترین طریق پر واضح کرنے کے لئے یہاں تک بھی فرما دیا کہ بفرضِ محال اگر یہ بھی شرک و معصیت کریں تو اُن پر بھی اسی طرح عذاب ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں پر۔ بلکہ ان پر عام لوگوں سے دُگنا عذاب ہوگا۔

اگر (بفرضِ محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دُگنا عذاب دیتے اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔

(۱۷/۷۴-۷۵)

کُفّار اعتراض پر اعتراض کرتے کہ رسول بھی ہمارے سے ہی، جلد

Marfat.com

کیوں ہیں۔ لیکن قرآن بار بار اس بات پر زور دیتے جاتا ہے کہ ہاں وہ انسان ہی ہیں اور انہیں انسان ہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔ (۱۵/۷)

جواب ملتا ہے کہ

ہم نے تم سے پہلے بھی جس قدر رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ (۲۵/۲۰)

اور پھر عام انسانوں کی طرح، اپنے وقت پر، مدّتِ حیات ختم کر کے اس دنیا کو چھوڑ جاتے تھے:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ۝ (۲۱/۳۴)

اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔ پھر اگر تم وفات پا جاؤ گے تو کیا وہ ہمیشہ رہیں گے۔

البتہ اُن کی بصیرت حقائق و معارف کے اُس اُفقِ اعلیٰ پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کی نگاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اُن کے مزکّی و مقدس نفوس کی بلندیاں کائنات کے اس معراجِ کمال پر ہوتی ہیں، جہاں عام انسانوں کا شہپرِ تخیل بھی جلتا ہے۔ اُن کے قلب و دماغ کی یہ بلندیاں اپنی نظیر

Marfat.com

آپ ہوتی ہیں اور یہ سب کچھ اس وحی کے ذریعے ہوتا ہے جس کا مہبط ان کا قلب منور بنتا ہے اور جس کے لئے انھیں خاص طور پر چُنا جاتا ہے۔ اس مقام تک کوئی دوسرا انسان نہیں پہنچ سکتا۔ بایں ہمہ وہ ہوتے انسان ہی ہیں، بشریت کی حدود سے خارج نہیں ہوتے۔ خدا کے عبد ہی ہوتے ہیں خود معبود نہیں ہوتے۔ اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آتے اس لئے نہیں کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھلائیں، بلکہ اس لئے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی محکومیت سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اُتر جائیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۸)

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ (وہ یہی کہے گا) کہ تم ربانی بن جاؤ۔ اس کتاب (کی اتباع) کے ذریعے جسے تم (دوسروں کو) سکھاتے بھی ہو اور (خود) پڑھتے بھی ہو (اور اپنے دل میں نقش کرتے ہو)

حضورؐ خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے اور اس مقصد رسالت کو اس

Marfat.com

انداز سے پورا کیا کہ دین اپنی مکمل شکل میں اُمت کے پاس آگیا۔

لیکن ذرا غور کیجئے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ساتھ کیا کیا۔ کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لئے حضور تشریف لاتے تھے۔ یہ "احمد بے میم" (احد) اور یہ عرب بلا عین (رب)، یہاں تک کہ

وہی جو مستویِ عرش ہے خدا ہو کر
اُتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفٰے ہو کر

وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں بلکہ خدا کے محتاج ہیں، انھیں تمام دنیا کے نفع و نقصان کا مالک و مختار قرار دے دینا، انھیں (معاذ اللہ) خدا بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کے عبد کو خدا کہنا عجیب توحید ہے۔ جب اعتراض کیا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ صہبائے عشق و محبت کی سرمستیاں ہیں۔ انسان سب کچھ اپنے محبوب ہی کو سمجھتا ہے۔ عوام کے جذباتِ عقیدت کو جوش میں لانے کے لئے فی الواقع یہ جواب مؤثر نظر آتا ہے لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ اُمم سابقہ نے جو اپنے رسولوں کو خدا بنا لیا تھا تو کیا بغض و عناد کی بنا پر بنایا تھا؟ وہاں بھی یہی غلو محبت ہی تو تھا جس نے ان کے محبوب کو وہ کچھ بنا دیا جسے قرآن کریم نے شرک قرار دیا۔ بغض و عناد اور نفرت سے بھی کسی نے رسولوں کو خدا نہیں بنایا۔ تو کیا پھر یہ دلیل مضحکہ انگیز نہیں کہ جو کچھ

Marfat.com

پہلی اُمتوں نے کیا وہ شرک تھا، اور اگر وہی کچھ اسی جذبہ کے ماتحت مسلمان کریں، تو عین توحید؟ ایک ہی بیج اور ایک ہی درخت سے دو مختلف پھل لینا فطرت کا مذاق اُڑانا ہے۔ اس میں کسے کلام ہے کہ حضورؐ کی محبت[1] ایک مسلمان کیلئے متاعِ حیات ہے، ایسی محبت جو ماں باپ، اولاد، اموال، بلکہ خود اپنی جان کی محبت سے بھی زیادہ ہو۔ جس عمل کی محرک آتشِ عشق ہو اس کا ایک لمحہ سو سال کے ٹھنڈے پانی سے وضو کردہ سرد نمازوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے کہ یہ صرف سر جھکاتا ہے اور وہ سر کٹاتا ہے، یہ زندہ رہنا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کا کچھ کام آ جائے اور وہ مرتا ہے کہ زندگی کسی پر سے نچھاور ہو کر ٹھکانے لگے۔ اسے ابھی حشر نشر، حساب، کتاب کے جھگڑے درپیش ہوتے ہیں اور اُس کی یہ حالت کہ تمیز ہی نہیں کیا جا سکتا کہ "تلوار رگِ جاں سے پہلے چھوئی تھی، یا جان باپ جنت سے۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (اقبال)

لیکن صہبائے عشق کی سرمستیوں میں حفظِ مدارج و مراتب بھی قرآن ہی نے سکھایا ہے۔ جو پی کر بہک گیا وہ خمخانۂ یثرب کا متوالا ہی نہیں۔ کیا آپ

---

[1] یاد رکھئے۔ رسول اللہ سے یہ محبت حضور کے انسانی پیکر سے محبت نہیں بلکہ اس پیغام سے محبت ہے جو آپ کی وساطت سے ملا۔ اسی کا نام خدا کی محبت ہے (نعوذ باللہ)
کیا لطیف مراتب ہیں حضور کی
ان میں کمی کی گئی ہے

نے نہیں دیکھا کہ جنّت کی شراب میں سب کچھ ہے لیکن نشہ نہیں ہے

لہٰذا خدا خدا ہے اور رسول رسول۔ اور رسول کا رتبہ یہی ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

اس سے آگے بڑھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس سے پیچھے ہٹنا کہ اسلام لانے کے لئے جہاں خدا کے لئے لا الٰہ الا اللّٰہ کی شہادت کی ضرورت ہے وہاں محمدؐ کے لئے عبدہٗ و رسولہٗ کی شہادت کی بھی۔ اور یہی ایمان و محبّت کی صحیح تصویر ہے۔ اس تصویر کے صحیح رُخ کے لئے دورِ رسالتؐ اور صحابہ کبارؓ کا طرزِ عمل دیکھئے۔ حضورؐ کی عمر بھر یہی تعلیم و تلقین رہی کہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند حیثیت نہ دیں اور اپنے ماننے والوں کے قلب و دماغ پر خدا بن کر نہ چھا جائیں۔ اس کے لئے حضورؐ نے ان میں حریتِ فکر ونظر کی ایسی رُوح پھونکی کہ آج اُس مزعومہ جمہوریت کے دور میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ معاملات میں مشاورت، صحابہؓ کا کئی ایک مواقع پر حضورؐ کی رائے سے اختلاف اور اختلاف کی کامل آزادی، حضورؐ کی رائے کے متعلق یہ تحقیق و استفسار کہ آپ نے وہ رائے یا حکم بہ منصبِ رسالت دیا ہے یا ذاتی حیثیت سے، یہ سب اس چیز کا آئینہ دار ہے کہ حضورؐ ایک عبدِ مومن میں کس درجہ انسانیت کی آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے اور ایک کا غلام بنا کر کس طرح دنیا بھر کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی تھا وہ

Marfat.com

ماحول جنہیں عقل انسان نے صحیح نشوونما پاتی اور جب انسان کو خدا نے اسطرح پیدا کیا تھا کہ وہ حیوان کی طرح سر جھکا کر نہ چلے وہ فی الحقیقت اس قابل ہو گیا کہ دنیا میں سر اٹھا کر چلے اسلام انسان کو یہی سر بلندیاں اور سرفرازیاں بخشنے آیا تھا اور یہی اس دین کی خصوصیت تھی۔ ہم نے جب خصوصیت کھو دی تو پھر وہیں جا گرے جہاں سے ابھرے تھے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ۔ کس قدر صحیح حقیقت ہے۔

پھر، اسے بھی سوچئے کہ "محبت رسول" سے مفہوم کیا ہے؟ یہ مفہوم قرآن نے خود متعین کر دیا ہے۔ جب نبی اکرمؐ خود موجود تھے تو بہ حیثیت مرکز ملت آپ کی اطاعت فرض اولیں تھی اور اطاعت الٰہی کہ ایک مستبد اور جابر حاکم کے احکام کی اطاعت نہیں بلکہ دل کے جھکاؤ کی اطاعت۔ اس لئے کہ یہ اطاعت، حضورؐ کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ احکام خداوندی کی اطاعت تھی، جن پر آپ خود بھی عمل کرتے تھے اور اُمت سے بھی عمل کراتے تھے۔ اور احکام خداوندی کی اطاعت، انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بروئدگی کے تقاضوں کی تسکین ہے۔ لہٰذا اس میں جبر کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ جس اطاعت میں دل کی خوشی شامل ہو، اس کو محبت کہتے ہیں۔ آج رسول اللہ سے محبت کا مفہوم ہوگا قرآنی نظام کی اطاعت اور الٰہی اطاعت جو بطیب خاطر کی جائے۔

یہ ہے محبت کا صحیح مفہوم۔ نہ یہ کہ حضورؐ کے سروقامت اور

Marfat.com

گیسوئے خمدار کی تعریف و توصیف میں نعتیہ غزلیں گائی جائیں یا رسول کو اٹھا کر خود خدا کی مسند پر بٹھا دیا جائے۔ اوّل الذکر وہ "شاعری" ہے جس سے قرآن نے منع کیا ہے اور ثانی الذکر وہ شرک جس کا تصوّر بھی ایک توحید پرست نہیں کر سکتا!

ائمہ پرستی

رسولوں کے بعد عوام کی عقیدت کے مرکز مذہبی پیشوا اور دین کے ائمہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اُممِ سابقہ کے کوائف و حالات سے ہمیں بتا دیا کہ رسولوں کے بعد یہی لوگ ہیں جن کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۱)

ان لوگوں نے خدا سے ورے ہی اپنے مذہبی علماء و پیشوایانِ دین کو رب بنا لیا۔

——— اس کے متعلق جب نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ حضورؐ! یہود و نصاریٰ کبھی اپنے احبار و رہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے تو حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حلال بتا دیں اور اسے حرام نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حرام کہہ دیں؟ یہی ارباباً من دون اللّٰہ" بنانا ہے یعنی جو منصب و حیثیت خدا کے لئے

Marfat.com

ہے وہ ان لوگوں کو دے دیں۔ یہی اُن کی پرستش ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مذہب کی پرستش یہ ہے کہ

(۱) ان کے فیصلوں کو خدا کے فیصلوں کی جگہ دے دی جائے اور

(۲) اُن کے ارشادات کو تنقید سے بالا سمجھا جائے۔

اُمم سابقہ نے یہ کچھ اس لئے کیا تھا کہ اُن کی آسمانی کتابوں کے اجارہ دار و محافظ اُن کے مذہبی راہنما تھے اور لوگ رشد و ہدایت کے لئے اُن کے محتاج تھے۔ چاہیئے یہ تھا کہ لوگ اُن کے فیصلوں کے لئے کتاب کی سند مانگتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ اُن کے ارکین مذہب نے کہہ دیا اسے فرمودۂ الٰہی سمجھ لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام اُن کے فیصلوں کو اسی لئے خدا کا فیصلہ سمجھتے تھے کہ اُن کے نزدیک وہ فیصلے خدا کے احکام کے مطابق ہوتے تھے، یعنی وہ ایسا باور کر لیتے تھے [رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگ خدا کے فیصلوں سے بے نیاز ہو گئے اور ان ہی احبار و رہبان کو خدا کا قائم مقام سمجھ لیا۔ اب اُن کا ہر حکم وحی منزل کی طرح واجب التسلیم اور اُن کا ہر فیصلہ آیت الٰہی کی طرح بالاز تنقید قرار دے دیا گیا۔ اسی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا:-

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۳/۷۲)

ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے

Marfat.com

لہٰذا قرآن ہی کی اتباع واجب ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو واضح، مفصل اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا کہ اس کے سمجھنے کے لئے "برہمنوں" (ملاؤں) کی کوئی خاص جماعت ہی مختص نہ ہو جائے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لے لی کہ قیامت تک اس میں نہ ردّ و بدل ہو سکے نہ ترمیم و تنسیخ۔

ان بدیہیات سے ظاہر ہے کہ دین کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے مسلمان قرآن کریم کی روشنی کے ماتحت عقل صحیح سے کام لے کر صراط مستقیم پر چلتے جائیں، خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ان کو راستے میں اندھوں کی طرح لاٹھی کی ضرورت ہی نہیں، کہ روشنی بھی موجود ہے اور بینائی بھی۔ لیکن غور سے دیکھئے کیا ہم واقعی اس روش پر چل رہے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑ دیجئے کہ اول تو وہ قرآن کریم کا مصرف بیش ازیں نہیں جانتے کہ یہ قسم اٹھانے کے کام آتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض قرآن پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح کہ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ - وہ صرف الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں۔ خواص، جو مذہب کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اُن کی یہ حالت ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق دینی فیصلہ پوچھئے یہی کہیں گے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق یہ

۲ : ۸۰

Marfat.com

فرمایا ہے، فلاں علامہ کی یہ رائے ہے، نسفی میں ایسا لکھا ہے، شارح وقایہ کا یہ خیال ہے غرضیکہ ان کی سند کسی نہ کسی انسان تک جاکر رہ جائے گی اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ذَالِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ کہیں خدا کا نام نہیں، کسی جگہ قرآن کا ذکر نہیں۔ اعتراض کیجئے تو جھٹ کہہ دیں گے کہ میاں! ان حضرات (علیہم الرحمۃ) نے بھی تو قرآن پڑھ کر ہی ایسا لکھا ہے۔ ان سے بڑھ کر اور کون قرآن کو سمجھ سکے گا؟ غور فرمائیے! اس جواب میں اور اس میں جو یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کے متعلق دیتے تھے کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا انہوں نے ان کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ایسا ہی کچھ سمجھ کر نہیں بنایا تھا؟

معاملہ یوں ہوا کہ جب مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو سلطنت کو لامحالہ تدوین قانون کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسلام میں چونکہ دین و دنیا الگ الگ نہیں اس لئے یہ قانون بھی دین ہی کی روشنی میں مرتب ہونا تھا۔ دین کی سمجھ رکھنے والے حضرات جمع ہوئے اور وقت کی ضروریات کو سامنے رکھ کر قانون کے ضابطے مرتب کئے۔ یہ ضابطے سرکاری توثیق سے مستند کرکے عدالتوں میں بھجوا دیئے گئے کہ مقدمات کے فیصلے ان ہی کے مطابق ہوا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی آئینی حکومت کے ضوابط قانون مرتب ہوکر نافذ العمل ہو جائیں تو پھر سوائے حکومت کے اور کسی کو اجازت

Marfat.com

نہیں ہوتی کہ وہ قانون مُرتب کرسکے یا ان میں ترمیم و تنسیخ کرسکے۔ بعینہٖ جس طرح سرکاری ٹکسال کے بعد کسی کو سکہ رائج الوقت بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تھی فقہ کی ابتدا اور یوں دوسروں کو ایک ہی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مکلف اور اس میں کمی بیشی یا ردّ و بدل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) نہ تو حضرات فقہا قیامت تک کا علم رکھتے تھے کہ ہر زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ایک ہی وقت میں مکمل قانون وضع کر دیں۔

(۲) نہ وہ (نعوذ باللہ) خدا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ استنباطِ مسائل میں اپنے نتائج کو تنقید سے بالاتر قرار دے دیں۔

زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان قوانین میں تبدیلی کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اور اس قانون پر کسی معیار اعلیٰ (قرآن کریم) کی روشنی میں تنقید بھی کی جاسکتی تھی۔ لیکن سلطنت نے جس بناء پر دوسروں کو قوانین میں ردّ و بدل کرنے (بالفاظ دیگر مزید اجتہاد) سے روکا تھا وہ علّت تو نظروں سے اوجھل ہوگئی اور بعد میں آنے والوں نے سمجھ لیا کہ بس اب تدبّر و تفکر کا دروازہ بابِ نبوت کی طرح بند ہوگیا۔ قرآن جتنا سمجھا جانا تھا سمجھا جاچکا۔ اس سے جو کچھ حاصل کیا جاسکتا تھا حاصل کر لیا گیا۔ اب اس کا وجود ہرگز دنیا میں رہے تو رہے عملی حیثیت سے

Marfat.com

اُمت اس سے بے نیاز ہو چکی۔ اب اس کے پڑھنے سے ثواب تو ضرور ملتا ہے لیکن اس کا سمجھنا دین پر اضافہ کرنا ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن حکیم جیسی زندہ اور زندگی بخش کتاب منتروں کا مجموعہ بن کے رہ گئی جن سے جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ کا کام لیا جا سکے یا زیادہ سے زیادہ اس کی ادبی اور لسانی لطافتوں پر بحث کر کے اسے الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھ لیا جائے۔ کیا یہی تھی وہ غرض جس کے لئے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمّہ داری اللہ تعالیٰ نے لی تھی؟

تدوینِ فقہ کا تعلق معاملات کی دنیا تک ہی تھا۔ اگر بابِ اجتہاد بند ہونا ہی تھا تو وہ اسی حصّہ تک بند ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ دین کے قصرِ مشید کا ہر ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر دی گئی۔ حقائق و معارف پر بھی اسی تقلید کے بادل چھا گئے۔ حتّٰی کہ نوبت بایں جا رسید کہ دین سے قطع نظر دیگر علوم و فنون میں بھی جو کچھ سلف نے لکھ دیا قولِ فیصل اور حرفِ آخر سمجھ لیا گیا۔ اب زمانہ کچھ کہے، آپ کی بصیرت کا تقاضا کچھ ہو، آپ نہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکتے ہیں جو کہا جا چکا ہے، نہ اس سے زیادہ کچھ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھا جا چکا ہے۔ نہ آپ کے سر میں دماغ اپنا ہو سکتا ہے نہ سینے میں آپ کا دل اپنا۔ نہ دیکھنے کے لئے آپ کی آنکھیں نہ سننے کے لئے کان۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ دنیا کہیں سے کہیں

Marfat.com

چلی گئی لیکن اُمتِ مسلمہ کی سطحِ فہم و ادراک جو ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد کے مُردے اُکھڑ گئے!

یہ میری جبینِ نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

غور تو کیجئے، کیا یہ سلف کی پرستش نہیں! یہ ان کو احبار و رہبان کی طرح خدا کا درجہ دینا نہیں!! کیا ان کی نگاہ کو قیامت تک آنے والے واقعات کا مُبصِر اور تمام حالات و کیفیات کا واقف سمجھنا اور اُن کے فیصلوں کو تنقید سے بالاتر قرار دینا، انھیں خدائی صفات کا حامل سمجھنا نہیں!! اللہ تعالیٰ نے اللہ والے (ربانیین) بننے کے لئے قرآن کریم ہی کو معیار قرار دیا تھا۔ (۳/۹) اس نے تو قرآن کریم کو نازل فرما کر اس کی تبیین و تفصیل بھی اپنے ذمہ لے لی تھی کہ لوگ اس باب میں بھی دوسروں کے محتاج ہو کر ان کی عبودیت اختیار نہ کریں۔

الٓرٰ۔ کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ (۱۱/۱-۲)

ایسی کتاب کہ جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف بھی بیان کی گئی ہیں خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے تاکہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبدیت اختیار نہ کرو۔ (اور) میں تم کو اس کی طرف سے آگاہ کرنے اور بشارت دینے کے لئے آیا ہوں۔

Marfat.com

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی غرض کیا بتاتا ہے جو نبی اکرمؐ کے واسطے سے دنیا تک پہنچا۔ سورۃ جاثیہ کے دوسرے رکوع میں سلسلۂ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائی، ان کو دیگر اقوام عالم پر فضیلت عطا کی اور انھیں دین کی بینات دی گئیں۔ لیکن انھوں نے علم آجانے کے بعد باہمی ضد اور ہٹ سے باہمی اختلافات پیدا کر لئے۔ اُن کے اختلافات کا تو قیامت میں فیصلہ کر دیا جائے گا لیکن دنیا کو تو ضرورت تھی کہ خدا کا وہ دین جو اختلافات کی نذر ہو کر مسخ ہو چکا تھا پھر سے دنیا کو مل جائے۔ اس کے لئے

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۵/۱۸)

پھر ہم نے تمہیں (اے رسول) دین کے ایک راستے پر مبعوث کیا۔ پس اس کا اتباع کرو اور ان لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو جن کو علم نہیں ہے۔

یہ دین شریعت کہاں ہے؟ اس کا جواب بھی وہیں ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (۴۵/۲۰)

یہ (قرآن) ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے بصیرت ہے اور ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت

Marfat.com

قرآن اور عقل

قرآن ہر زمانے کے انسانوں کے لئے بصائر ہے۔ اس میں بار بار غور و فکر، تدبر و تفحص کی تاکید کی گئی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو کہیں شر الدواب کہا گیا، کہیں کالانعام بنایا گیا۔ جہنم اُن سے بھری گئی۔ اُن کے قلوب پر مُہریں، اُن کی آنکھوں پر پردے اور اُن کے کانوں میں ڈاٹ بتائے گئے۔ کہئے جو کتاب اس طرح عقل و بصیرت کو دعوت دیتی ہو اور جس کے لانے والے کا خود دعویٰ یہ ہو:

اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِ

میری اور میرے متبعین کی دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت ہے۔

اس کتاب میں کورانہ تقلید کی کہاں گنجائش ہے۔ جمود و تعطل وہ کب روا رکھ سکتی ہے۔ قرآن انسانوں کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہنے والا تو خواہ ظلمت میں ہو خواہ نور میں یکساں ہے۔ علم، اجتماعی حیثیت سے، قوموں میں وراثتاً منتقل ہوتا اور قومی سرمایہ کی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن جو قوم علم کی کسی خاص سطح کو منتہائے کمال سمجھ کر فارغ ہو بیٹھے اس کا مآل معلوم۔ چنانچہ وہ قوم جو دنیا میں تمام نوع انسانی کی امارت کے لئے آئی تھی دنیا کے پیچھے پیچھے رہنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ملت جس کے ہاتھ میں ایسی عظیم الشان تبدیلی دی

Marfat.com

گئی تھی کہ اس کی روشنی مشرق و مغرب کے امتیازات مٹا کر اقصائے عالم کو منور کرنے والی تھی اب ہر جگنو کو شمع راہ سمجھ کر اس کے پیچھے لپکنے کی خوگر ہو گئی۔ یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں سہل انگاری اور آرام طلبی تھی۔ اجتہاد کے لئے ذہنی جہاد اور اس کے ساتھ ساتھ جسمانی مجاہدے کی ضرورت تھی۔ تقلید میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی جن کو باپ دادا کے ورثہ سے دیانت مل جائے وہ خود محنت کیوں کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وراثت میں سکہ ان کو وہ ملے جو اصحاب کہف کے سکہ کی طرح صدیوں پہلے کا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تقلید اختیار ہی وہ قوم کرتی ہے جس میں مجاہدانہ روح باقی نہ رہے۔ ہر قوم کی تاریخ ہمیں ایسا ہی بتاتی ہے۔ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔

> تم سے پہلے (بھی) کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا کہ وہاں کے
> خوش حال (آرام طلب) لوگوں نے یہ نہ کہدیا ہو کہ ہم نے اپنے آبا کو
> ایک طریق پر پایا اور ہم ان ہی کے نشانات کا اقتدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔
> (۴۳/۲۳)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس مکافات عمل کے دن کہ جب سمع و بصر و قلب ہر ایک سے الگ الگ باز پرس ہو گی، آپ یہ کہکر نہیں چھوٹ سکیں گے کہ ہم نے فلاں امام کی تقلید کی تھی، فلاں عالم کا اتباع کیا تھا۔ متبوع حضرات آپ کے اس اتباع سے ہی انکار کر دیں گے کیونکہ انہوں نے

Marfat.com

کبھی کسی کو ایسے اتباع کا حکم نہیں دیا تھا۔

جس وقت وہ لوگ جو متبوع تھے اپنے متبعین سے بیزار ہو جائینگے اور سب عذاب کا مشاہدہ کریں گے۔ ان کے باہمی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے۔ (۲/۱۶۶)

اس وقت متبعین سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جو اُن کی پرستش شروع کر دی۔

کیا تمہارے پاس پیغمبر بیّنات لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تو تھے (۴۰/۵۰)

اور یہ بھی سمجھ رکھئے کہ مکافاتِ عمل کے ظہور نتائج کا دن صرف مرنے کے بعد ہی نہیں آئے گا۔ اس جہان سعی و عمل میں زندہ قوموں کے لئے ہر سانس ظہور نتائج کا لمحہ ہوتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر قیامت نمودار ہو رہی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ ایک نیا حشر برپا ہوتا ہے۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے معاذ اللہ سب گمراہ کن ہے۔ ایسا کون کہہ سکتا ہے؟ مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملا ہے آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ شمع قرآن کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح کے انسان تھے۔ غلطی کر سکتے تھے۔ لیکن قرآن کی کسوٹی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ جو اس کسوٹی پر پورا اترے دین وہی ہے۔ اور بس۔ وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

Marfat.com

اسلاف پرستی

اسلاف پرستی کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم تو غلطی کر سکتے ہیں لیکن ہمارے بزرگوں سے غلطی کا امکان نہیں تھا۔ لیکن آپ اس دلیل کو ذرا آگے بڑھائیے تو اس کی حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جائے گی۔ یعنی ہم اپنے آپ کو غلطیوں سے منزّہ قرار نہیں دیتے۔ لیکن ہمارے بعد کے آنے والے ہمیں اپنا اسلاف سمجھیں گے اور اسلاف سمجھ کر یہ عقیدہ قائم کر لیں گے کہ ان اسلاف سے غلطی نہیں ہو سکتی تھی البتہ ہم غلطی کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا۔ یقین مانئے! ہمارے اسلاف بھی ہماری طرح یہی کہتے تھے کہ ہم منزہ عن الخطا نہیں ہیں لیکن یہ بعد کے آنے والے تھے جنہوں نے انہیں منزہ عن الخطاء قرار دے کر ان کے ہر فیصلہ کو وحی آسمانی کی طرح تنقید کی حدود سے بالاتر قرار دے دیا۔ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ "کسی شخص کے لئے ہمارے کسی قول کا اتباع جائز نہیں تاوقتیکہ وہ ہمارے مآخذ کو نہ جان لے"۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "جو شخص ہم کو بلا حجت لیتا ہے اس کی مثال رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والے کی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ لکڑی کی جگہ سانپ پر ہاتھ ڈال دے"۔ امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ "میں بھی انسان ہوں۔ میری رائے صائب بھی ہوتی ہے اور غلط بھی"۔ امام احمدؒ کا قول ہے کہ "انسان کی ناسمجھی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دین کو اشخاص کے ہاتھ میں دیدے"۔ وقس علیٰ ذالک

Marfat.com

یہ حضرات وہ ہیں جنہیں اجتہاد تامہ کا درجہ حاصل تھا۔ جب وہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے تھے تو تا بدیگراں چہ رسد لیکن بعد میں آنے والوں نے انہیں ہر طرح کی خطا، سہو اور غلطی سے معصوم سمجھ کر ان کے اقوال کو پیغام خداوندی قرار دے دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ "ان ائمہ کے فیصلے کے بعد ہمیں آنکھیں بند کر لینی چاہئیں"۔ امام شافعیؒ کی خود یہ کیفیت تھی کہ ایک سال ایک فیصلہ دیتے تھے لیکن دوسرے سال مزید تفقہ و تدبر سے اسے منسوخ قرار دے دیتے تھے لیکن ان کے بعد ان ہی ائمہ کی تقلید کرنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "انسانی آراء و اقوال تو ایک طرف ہر وہ آیت جو ہمارے مسلک کے خلاف جاتی ہو یا مؤول ہے یا منسوخ"۔ یعنی قرآن کریم کو بھی ان حضرات کے مسلک کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اگر کوئی آیت قرآنی ان کے مسلک کے خلاف جائیگی تو یا تو اس کی ایسی تاویل کر لی جائے گی کہ وہ اس مسلک کے مطابق اُتر آئے اور اگر اس کی ایسی تاویل نہ ہو سکے تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اللہ اکبر! خدا کے احکام انسانی فیصلوں کی رُو سے منسوخ قرار دیئے جائیں گے۔

فرقہ پرستی

پھر مسلمان صدیوں سے تحزب و تشیع، فرقہ بندی اور گروہ سازی کی جس مشرکانہ زندگی سے گزر رہا ہے کہ

Marfat.com

قرآن کریم دین میں تفرقہ اندازی کو صریح الفاظ میں شرک قرار دیتا ہے، غور سے دیکھئے تو اس کی تہ میں بھی اسلاف پرستی ہی کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا۔ ہونے کو فروعی معاملات میں اختلاف کہاں نہیں ہوتا۔ اور تو اور خود صحابہ کبارؓ میں بعض مسئلوں میں ذاتی طور پر اختلاف تھا حضرات ائمہ کا یہ عالم تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردانِ رشید امام ابویوسفؒ و امام محمدؒ سینکڑوں مسائل میں اپنے استاذ سے اختلاف رکھتے تھے۔ بایں ہمہ ان ذاتی اختلافات کی بنا پر وہ حضرات کوئی نیا دین، کوئی جداگانہ فرقہ نہیں بنا لیتے تھے۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے جب اسلاف پرستی شروع کی اور ایک مخصوص مسلک کے متبعین نے سمجھ لیا کہ ہمارے مسلک کے مؤسس منزہ عن الخطا تھے تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑا کہ اس مسلک کے خلاف چلنے والے بدیہی طور پر گمراہی پر ہیں۔ یہی کچھ مخالف مسلک والوں نے سمجھا۔ نتیجہ اس کا بغیاً بینہم (باہمی ضد اور ہٹ) کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور یہی ضد اور ہٹ ہے جسے قرآن کریم اختلاف آراتی اور تفرقہ انگیزی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اور اس کے بعد (کل حزب بما لدیھم فرحون کے مطابق) ہر شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ جس فرقے سے میں متعلق ہوں وہ "ناجی" اور باقی سب جہنمی ہیں اور ہر شخص کی تمام جد و جہد اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ اپنے فرقہ کو برسرِ حق اور دوسروں

Marfat.com

باطل پرست ثابت کردے۔ نہ اس میں تحقیق کا مادہ باقی رہتا ہے۔ نہ حقائق کو خالی الذہن ہو کر پرکھنے کی صلاحیت وہ اپنے مسلک کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے پاس اپنے مسلک کی حقانیت کے محکم دلائل ہوتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اگر اپنے مسلک میں کسی غلطی کا امکان تسلیم کرے تو اس سے اسے اپنے اسلاف میں بھی غلطی کا امکان ماننا پڑے گا۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے تسلیم کرنے کے لئے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس سے اس کے "دین" کی فلک بوس عمارت زمین پر آگرتی ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ یہ اختلافات بہت چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہوتے ہیں۔ ایسی معمولی باتوں میں کہ آپ سنیں تو حیران رہ جائیں کہ یہ کونسا ایسا معاملہ ہے جس پر یوں آستینیں چڑھائی جائیں۔ لیکن ان حضرات کے سامنے چونکہ زندگی کا کوئی صحیح مقصد نہیں۔ دین کا کوئی واضح نصب العین نہیں اس لئے وہ اختلافات کی ان حد بندیوں کی حفاظت ہی کو ذریعۂ نجات سمجھے ہوتے ہیں اور ان کا تحفظ ہی ان کے نزدیک عین جہاد ہے۔ ایک دفعہ دیکھنے میں آیا کہ ایک بہت بڑے مولوی صاحب کا نہایت پرشکوہ جلوس جا رہا ہے۔ "غازی اعظم زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے فضا مرتعش ہو رہی ہے۔ مسرت کے شادیانے بج رہے ہیں۔

Marfat.com

خوشی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان صاحب نے کسی مجلس مناظرہ میں امام ابوحنیفہؒ کی شان میں سوء ادبی کے کلمات کہے۔ اس پر مقلدین حضرات نے ان پر مقدمہ چلایا۔ مقدمہ نے طول کھینچا، سزا ہوئی لیکن اپیل میں بری ہو گئے اور اب فاتحانہ انداز سے مظفر و منصور خیر سے مراجعت فرمائے وطن ہو رہے ہیں۔ آپ ان رُوح فرسا مناظر کو دیکھ کر بے شک ہنس دیجئے۔ لیکن ان کی اہمیت ان حضرات سے پوچھئے۔ ان کے نزدیک تو عاقبت سنوارنے کا ذریعہ ہی یہی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ اسلاف پرستی نے درحقیقت خدا پرستی کی جگہ لے رکھی ہے۔ جو کچھ خدا کے لئے ہونا چاہیئے تھا وہ سب اسلاف کی عظمت وعقیدت کے لئے ہو رہا ہے۔

پھر ایک اور بات بھی بڑی دل چسپ ہے۔ ظاہر ہے کہ فقہی احکامات و مسائل درحقیقت ان قوانین کا نام ہے جو اسلامی سلطنت کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ سلطنت تو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکی لیکن ان قوانین کی فروعی اختلافات کی جنگ برابر جاری ہے۔ ان حضرات کی عمر ان اختلافات سے متعلق بحث وجدل میں گزر جاتی ہے۔ لیکن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ اس قوت کے پیدا کرنے کی بھی کوئی تجویز کی جائے جس کی بناء پر ان قوانین و احکام کو منوایا جائے گا۔ اور حق یہ ہے کہ جس قوم

Marfat.com

کے قوائے ذہنی وعملی پر اس درجہ تعطّل وجمود چھا جائے وہ کش مکش حیات سے اسی طرح گریز کیا کرتی ہے اور یہ نفس انسانی کی شعبدہ کاریاں ہیں کہ وہ اس فرار کو بھی جہاد بنا کر دکھا دیتا ہے۔

یہ تو ائمہ فقہ اور علماء سلف کی تقلید و اتباع سے متعلق تھا۔ ائمہ پرستی میں ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے، لیکن وہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم اور مامور من اللہ مانتے ہیں اور اس امامت کو ایک خاندان میں مقید و محدود سمجھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اس قسم کے عقائد کو قرآن کریم کی رُو سے نسل پرستی سمجھے اور اس مقصد عظیم کی نقیض جس کے لئے اسلام آیا تھا، وہ ان عقائد کے متعلق کیا کہے؟ لہٰذا ان حضرات سے ہمارا تخاطب ہی لاحاصل ہے۔

۳

رواۃ پرستی

اس مضمون کی قسط اوّل میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کا نصب العین تو یہ تھا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرے۔ لیکن بعد میں مسلمانوں نے کس طرح اپنے اور اپنے خدا کے درمیان مختلف حاجب و دربان مقرر کر لئے اور دین کے راستے میں براہ راست خدا تک پہنچنے کے بجائے راستے میں ارباب من

Marfat.com

دون اللہ" کا دامن تھام کر بیٹھ گئے۔ اس سلسلے کی پچھلی کڑی میں اس کورانہ تقلید کا ذکر آیا تھا جو ائمہ پرستی کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہو گئی آج سے کچھ عرصہ پیشتر اس جامد تقلید کی خرابیوں کا احساس نمودار ہوا۔ اور ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اس کی شکست و ریخت کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ یہ کوشش بڑی مبارک تھی لیکن شاید ابھی مسلمانوں کے ابتلاء کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اُن کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ

خواستم پیکاں برآرم۔ درجگر نشتر شکست!

ائمہ پرستی کے کانٹوں سے دامن چھڑانے گئے تھے لیکن خود ایک اور جھاڑی میں الجھ کر رہ گئے۔ یہ "جھاڑی" عقیدت و ارادت کے اس قدر خوشنما اور نظر فریب پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے کہ دامن کو الجھانے والے کانٹوں کو بے نقاب دیکھنا بڑا دقت طلب ہے۔ اس لئے جو کچھ اس "حصہ مضمون" میں عرض کیا جائے گا اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان خیالات کو جو پہلے سے آپ کے قلب و دماغ پر مستولی ہیں تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیجئے اور یوں خالی الذہن ہو کر، ٹھنڈے دل سے بہ نگاہ تفکر و تدبر غور کیجئے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ یہ تاکید اس لئے ضروری سمجھی گئی ہے کہ مسئلہ زیر نظر جس قدر اہم ہے اسی قدر نازک بھی ہے۔ لہٰذا اہمیت و نزاکت کی اس کش مکش میں قلب و دماغ میں تصادم

Marfat.com

ناگزیر ہو جائے گا اور اگر آپ ان جذبات کی رو میں بہہ گئے جو فضا میں چاروں طرف پھیلے ہوتے ہیں تو آپ حقیقت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ نگاہِ بصیرت سے بھی کام لیجئے اور دعا کیجئے کہ اَللّٰهُمَّ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔

قرآن اور حدیث

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ دین کس چیز کا نام ہے، وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ "قرآن و حدیث" کا مجموعہ۔ یہ چیز ہمارے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ اس کے متعلق بھی کسی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ گویا یہ ایک ایسی حقیقتِ ثابتہ ہے جو کبھی محلِ نظر نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسا مسلّمہ ہے جس میں کسی تردد کی گنجائش ہی نہیں۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں، یہ چیز بھی اس قابل ہے کہ اس پر غور و فکر کیا جائے اور سوچا جائے کہ جو کچھ عام طور پر مشہور ہو چکا ہے وہ درحقیقت ایسا ہے یا نہیں۔ تو اس آواز کے خلاف کس قدر ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور مخالفت کی کتنی قوتیں ہوں گی جو اس کے مقابل ہجوم کر کے چلی آئیں گی۔ اب اگر آپ اس ہنگامہ و ہجوم کے شور و غوغا میں کھو گئے تو آپ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے آپ کو نہ صرف اپنے داخلی جذبات کے غیر محسوس طوفان ہی کا مقابلہ کرنا ہوگا بلکہ ان خارجی ہنگاموں کے غلغلہ انداز سیلاب کو بھی برداشت کرنا پڑے گا اور حق یہ ہے کہ جب

Marfat.com

تک اس قدر شدید جدوجہد نہ کی جائے عروسِ حقیقت بے نقاب جلوہ پیرا نہیں ہوسکتی وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

دین کے متعلق ایک چیز سے تو یقیناً آپ سب متفق ہوں گے، یعنی یہ کہ دین وہی ہو سکتا ہے جو یقینی ہو، ظنّی اور قیاسی نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۱/۳۶)

اور ان میں سے اکثر لوگ ظن کے سوائے کسی اور چیز کی اتباع نہیں کرتے۔ یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ خوب واقف ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن دو اجزاء (قرآن اور حدیث) کے مجموعے کا نام دین سمجھا جاتا ہے اِن میں سے کوئی ظنّی تو نہیں؟ اور کیا یہ دونوں اجزاء اللہ اور اس کے رسول نے دین کی حیثیت سے مسلمانوں کو دیئے ہیں؟

پہلے قرآن کریم کو لیجئے۔ قرآن میں ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب حق ہے۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ .... (۳۵/۳۱)

جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کیا ہے وہ (بالکل) حق ہے .... !

اس کتابِ عظیم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

Marfat.com

لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، یہ سراسر حق ہے، یقینی ہے ظنی اور قیاسی نہیں، ریب و شکوک کی حدود سے بالاتر ہے۔ یہ تو ہے نفس کتاب کے متعلق۔ اب یہ کہ یہ یقینی شئے مسلمانوں کو ملی کیسے اور اُن کے پاس رہے گی کس حیثیت سے سو ظاہر ہے کہ قرآن کریم حضورؐ پر نازل ہوا اور اس کے متعلق جمع و تدوین کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اُوپر لی۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ (۷۵/۱۷)

یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اسکا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے

اور صرف جمع و تدوین ہی نہیں بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل اور کسی نوعیت کی تحریف والحاق نہ ہو سکے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس حفاظت کو عملی شکل دینے کے لئے جناب نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا کہ

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (۵/۶۷)

اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دو۔

قرآن حضورؐ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل میں جو کچھ کیا وہ آپ

Marfat.com

کے سامنے ہے یعنی صحابہ کبارؓ کی ایک جماعت تھی جنہیں قرآن کریم کا ایک ایک لفظ لکھوا دیا جاتا تھا۔ ہزاروں حفاظ تھے جنہیں لفظاً لفظاً یاد کرایا جاتا تھا۔ پھر حضورؐ اُن کا یاد کردہ خود سُنتے تھے اور اُن کی تصحیح و تصویب فرماتے تھے۔ چنانچہ دنیا سے تشریف لے جانے سے پیشتر حضورؐ نے کامل اطمینان کر لیا کہ پیغامِ خداوندی جو اُن پر نازل ہوا تھا وہ اپنی کامل و مکمل شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ لکھا ہوا بھی محفوظ ہے اور ہزاروں حفاظ کے سینوں میں مصئون۔ حجۃ الوداع کے عدیم النظیر خطبہ میں حضورؐ نے لاکھوں مسلمانوں کے مجمع سے اس امر کا اقرار لیا کہ آپ نے اس پیغامِ الٰہی کو ان تک پہنچا دیا ہے۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو اس پر گواہ قرار دیا کہ تُو شاہد ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ رسالت یوں ادا کر دیا ہے۔ اس انتظام و اطمینان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سند نازل ہوئی کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ (آج کے دن ہم نے دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تمہارے اُوپر اپنی تمام نعمت کا اتمام کر دیا) نبی اکرمؐ کے بعد خلفاء راشدین (رضی اللہ عنہم) نے حفاظت قرآن کریم کو سب سے بڑا فریضہ سمجھا اور اس کے لئے عملی ذرائع اختیار کئے۔ چنانچہ یہ صحیفۂ ربانی آج تک حفاظ کے سینوں میں اور صفحاتِ قرطاس پر اس انداز سے محفوظ چلا آرہا ہے

Marfat.com

کہ اپنے تو اپنے غیروں تک کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو قرآن کریم موجود ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے انھیں دیا تھا اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے اس لئے اس کا یہ آخری پیغام قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔ یہ ہے یقینی چیز جس کے دین ہونے میں ظن وقیاس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اب اس حصہ کو لیجئے جسے عام طور پر دین کا دوسرا جزو قرار دیا جاتا ہے، یعنی مجموعۂ احادیث، دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ بھی اسی طرح یقینی ہے جس طرح قرآن کریم ہے۔

حدیث

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا نہ اُن کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

خدا کے بعد خدا کے رسول کا اس باب میں کیا طرز عمل رہا؟ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے، اس لئے کہ احادیث نبی اکرمؐ کے اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر یہ جزو دین تھیں تو جس طرح آپ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا، زبانی یاد کرایا، لوگوں سے سُنا، دُہرایا، اور ہر طرح سے اطمینان فرما لیا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے

Marfat.com

احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ منصبِ رسالت کا یہی تقاضا تھا اور بہ حیثیت رسول حضورؐ کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں اُمت کے پاس چھوڑتے۔ لیکن حضورؐ نے جہاں قرآن کریم کے متعلق اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا، برعکس اس کے خود کتب احادیث میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (صحیح مسلم)

مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز لکھی ہو اُسے مٹا ڈالے۔

کہا جاتا ہے یہ حکم عارضی تھا۔ اس لئے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی درخواست پر انہیں اجازت عطا فرما دی تھی کہ

لے اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب تم احادیث کو یقینی نہیں سمجھتے تو ان کو بطور دلیل کے پیش کیوں کرتے ہو؟ سو واضح رہے کہ یہ چیز بطور دلیل ان کے لئے پیش کی جاتی ہے جو انہیں یقینی مانتے ہیں تاکہ وہ دیکھ لیں کہ خود احادیث بھی ان کے مسلک کے خلاف جاتی ہیں ورنہ جہاں تک ہمارے لئے حجت شرعیہ اور اطمینان قلب کا تعلق ہے الحمد للہ کہ اللہ کی کتاب کافی ہے حسبنا کتاب اللہ اور اس کے بعد تاریخ میں وہ چیزیں جو کتاب اللہ کے مطابق ہیں۔

Marfat.com

وہ چاہیں تو احادیث لکھ لیا کریں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوگا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا۔ پھر اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اس نے کون کونسی حدیثیں لکھی ہیں اور اس سے وہ احادیث سنی ہوں اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے ان کی یادداشت پر بھروسہ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کر لینا ہی کافی تھا تو قرآن کریم لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے لوگوں کی یادداشت کیوں نہ کافی سمجھی گئی!

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم کا تو لفظ لفظ یاد کرایا جاتا تھا اور پھر اُن سے سُن لیا جاتا تھا اور اُس کی تصدیق فرمائی جاتی تھی (اگر کچھ احادیث کسی نے اپنے طور پر یاد بھی کر لی ہوں تو اُمّت کے لئے وہ سند نہیں ہو سکتیں۔ تاوقتیکہ نبی اکرمؐ ان احادیث کو سُنکر ان کے مستند ہونے کی تصدیق نہ فرما دیتے اور انہیں ایک کتاب میں محفوظ کر کے اُمّت کو نہ دے جاتے۔ اور پھر وہی احادیث قرآنِ کریم کی طرح اپنے اصلی الفاظ میں آگے نہ چلتیں) لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمایئے کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو ہوتیں تو

Marfat.com

کیا رسول اللہ ان کی حفاظت کا کچھ انتظام بھی نہ کرتے ؟

روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق قلمبند ہوتی تھیں۔ مثلاً وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمّال کے نام بھیجے۔ لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسب ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا۔

(۱) پندرہ سو صحابہ کے نام (ایک رجسٹر میں)

(۲) مکتوبات گرامی جو حضورؐ نے سلاطین و اُمراء کے نام لکھے۔

(۳) تحریری احکام، فرامین اور معاہدات وغیرہ۔

(۴) کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلمبند کیں۔ ان احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے اُن کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی یہ بعد میں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود رہیں۔ لہٰذا رسول اللہؐ نے جو کچھ اُمّت کو دیا تھا وہ صرف قرآن تھا۔ احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہؐ نے اُمّت کو نہیں دیا۔ خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے (اُمّت کے لئے) کیا چھوڑا ہے، تو آپ نے کہا کہ

Marfat.com

مَا تَرَكَ اِلَّا مَا بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ۔ یعنی قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا۔ (بخاری جلد سوم کتاب فضائل القرآن ص ۱۷۳)

حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ کا زمانہ آتا ہے۔ ان برگزیدہ حضرات نے قرآن کریم کی نشر واشاعت اور حفاظت وصیانت میں جو کوششیں کیں ان کا اجمالی ذکر اوپر آچکا ہے۔ اب دیکھئے کہ احادیث کی جمع وتدوین وترویج وتحفظ میں ان کا طرز عمل کیا رہا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ

> حضورؐ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ آپ نے لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ سے حدیثیں بیان کرتے ہو اور اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے ان میں تم سے زیادہ اختلاف پیدا ہوگا۔ اس لئے تم لوگ رسول اللہؐ سے کوئی حدیث بیان نہ کرو۔ جو شخص تم سے حدیث پوچھے اس سے کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام۔

یہیں تک نہیں بلکہ تذکرۃ الحفاظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ بھی تھا لیکن آپ نے اسے یہ کہہ کر جلا دیا کہ مجھے خوف ہے کہ میں مرجاؤں اور یہ محفوظ رہ جائے ممکن ہے کہ میں نے اس میں ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں۔

Marfat.com

اور مجھے ان پر وثوق ہے لیکن وہ حدیثیں ایسی نہ ہوں۔

حضرت عمرؓ نے اس باب میں اور بھی شدّت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرظہ بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کر دی کہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں، تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابودرداؓ اور ابومسعودؓ انصاری کو کثرت روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا (ان تمام روایات کے لئے دیکھو تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محلِ نظر قرار دے دیا جائے، حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی اور عمل رسول اللہ کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ

Marfat.com

خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعۂ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا اُن کی زیرِ نگرانی مدوّن کیا گیا ہو۔ بلکہ حضرت عمرؓ کے سامنے تو ایک مرتبہ یہ معاملہ پیش بھی کیا گیا کہ احادیث کو لکھ لیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کامل ایک ماہ تک اس معاملہ میں استخارہ کیا لیکن اس کے بعد فرمایا "میں نے تحریرِ حدیث کا ذکر کیا تھا لیکن جب میں نے غور کیا تو اس قوم کا خیال آیا جس نے خود ایک کتاب لکھی اور اس پر اس قدر متوجہ ہوئی کہ خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا۔ اس بناء پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کبھی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہ کروں گا۔[1] (طبقات ابن سعد)

اِن تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کی عام نشر و اشاعت کا اہتمام فرما دیا تھا، خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے کیوں نہ شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسول اللہ کے بعد، خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

جمعِ حدیث

خلافتِ راشدہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس بات کا کسی کو خیال نہیں پیدا ہوا۔ سنہ اھ کے قریب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (اموی خلیفہ) نے کچھ احادیث کو اپنے طور پر جمع کرایا۔

---

[1] علامہ خضری کی کتاب فقہ اسلامی میں یہ روایت تنویر الحوالک کے حوالہ سے نقل ہے۔

Marfat.com

اُن کے بعد امام ابن شہاب زہریؒ (المتوفی ۱۲۴ھ) نے خلفائے ...
سے ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا جس کے متعلق ان کا اپنا قول ہے کہ یہ
یہ کام ناگوار گزرا[۱]۔ لیکن نہ تو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؓ کی جمع کردہ احادیث کسی
مدوّن صحیفہ کی شکل میں موجود رہیں اور نہ امام زہریؒ کا مذکورۂ صدر مجموعہ ہی کہیں
موجود ہے البتہ بعد کی کتب احادیث میں ان کی روایات ملتی ہیں۔ اس کے
بعد وہ زمانہ شروع ہوا جب لوگوں کو قرون اولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ)
لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ خیال پیدا بھی ہونا چاہیئے تھا۔ مسلمانوں کے
لئے دنیا میں عزیز ترین یاد اسی عہد مبارک کی ہے جس میں نیّرِ اسلام کا
طلوع ہوا اور اس کی ضیا پاشیوں سے تمام دنیا بقعۂ نور بن گئی۔ اس دور
میں کتب سیرت کی تصنیف کی ابتدا ہوئی۔ ان تصانیف کا مسالہ Material وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور
چلی آتی تھیں۔ یہ باتیں اس تمام عہد کو محیط تھیں۔ بعض حضرات نے اس وسیع
موضوع کو سمٹایا اور صرف ان ہی باتوں کو اکٹھا کیا جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب
کی جاتی تھیں۔ ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتب احادیث ہے (احادیث کے
معنی ہی باتیں ہیں) احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت دستیاب ہو سکتا
ہے امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) کی کتاب مؤطا ہے۔ اس کے مختلف نسخوں

---

[۱] مختصر جامع بیان العلم۔

Marfat.com

ہیں تین سو سے پانسو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اور دوسرے ائمہٴ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں کئی ایک کتبِ احادیث مدوّن ہوئیں۔ عہدِ عباسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتبِ احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کر لی۔ کتبِ احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و مسلم) ہیں۔ امام بخاریؒ (المتوفی ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کاٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد دو ہزار چھ سو نیس احادیث ہیں اسی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے۔ کتبِ احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں اب دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔

حدیث کی صحیح حیثیت

تدوینِ کتبِ احادیث کی اس مختصر سی تاریخ سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ احادیث کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ اگر یہ چیزیں بھی دین کا جُزو ہوتیں تو ظاہر ہے کہ خود نبی اکرمؐ احادیث کا مستند مجموعہ لکھوا کر چھوڑ جاتے آپ کے بعد آپ کے جانشین (خلفائے راشدینؓ) اس مجموعہ کے مصدّقہ نسخے مختلف مقامات میں بھیجتے۔ یہی مجموعہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ دین کا جزو بنا دیتا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح انفرادی طور

Marfat.com

پر بعض لوگوں نے کتب تاریخ تصنیف کیں، اسی طرح کتب احادیث کو مدوّن کیا (اب خیال فرمائیے کہ کیا دین بھی ایسی چیز ہے جسے خود اللہ تعالیٰ اور نبی اکرمؐ یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ امام بخاری یا ایسے دیگر حضرات نے ان باتوں کو یک جا جمع کر دیا جو اس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں۔ ورنہ جس طرح انؒ سے پہلے اس قسم کی کوئی کتابیں موجود نہ تھیں، اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو "دین کا آدھا حصّہ" (معاذ اللہ) بالکل کھویا ہوا تھا۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کی سند قرآن کریم میں بالتصریح فرما دے اور وہ رسول گرامیؐ جن کے بعد قیامت تک کسی اور رسول نے نہ آنا ہو وہ دین کے ایک ایسے اہم حصّہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے، ایسا تصوّر میں بھی نہیں آسکتا۔)

ایک دوسری صورت بھی تھی۔ جس طرح قرآن کریم محفوظ کیا گیا تھا اگر لوگ نبی اکرمؐ کی احادیث کے الفاظ کو یاد کر لیتے اور وہی الفاظ سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہتے تا آنکہ وہ کتابی شکل میں لکھ لئے جاتے تو بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ کتب احادیث کا مجموعہ ایک حد تک یقینی ہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں ہوتی۔ احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں (بخاری اور مسلم سمیت) ان کے الفاظ رسول اللہ کے نہیں ہیں

Marfat.com

یہ احادیث، روایات بالمعنیٰ ہیں یعنی ان کا انداز یہ ہے کہ مثلاً ایک صحابیؓ نے رسول اللہ سے کچھ سُنا، اس نے جو کچھ سمجھا، اپنے الفاظ میں کسی دوسرے سے بیان کیا۔ اُس نے جو کچھ اخذ کیا اسے آگے منتقل کیا۔ اب ذرا تصور میں لائیے اس صورتِ حالات کو۔ یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال نہیں بلکہ دو اڑھائی سو سال تک یونہی جاری رہے اور اس کے بعد لوگوں میں اس قسم کی پھیلی ہوئی باتوں کو یک جا جمع کیا جائے

روایات بالمعنیٰ

تو ان باتوں کو پہلے کہنے والے (یعنی نبی اکرمؐ) کے بیان فرمودہ مفہوم سے جس قدر تعلق ہو گا وہ ظاہر ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ آپ ایک کمرے میں دس آدمیوں کو بٹھا کر ایک کے کان میں کسی واقعے کی تفصیل بیان کیجئے، اس کے بعد یہ بات کانوں کان منتقل ہوتی ہوتی جب پھر آپ تک پہنچے تو آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس میں اور جو کچھ آپ دسویں آدمی سے سن رہے ہیں اس میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ اور جب یہ سلسلہ اڑھائی سو سال تک جاری رہے اور کروڑوں نہیں تو کم از کم لاکھوں آدمیوں کے ذریعے سے یہ باتیں آگے منتقل ہوتی ہوں تو ان میں جو اصلیت باقی رہے گی وہ ظاہر ہے۔ جو بات کانوں کے راستے قلب تک پہنچے اور پھر قلب سے زبان کی راہ باہر آئے۔ اس پر قلب انسانی کی رنگینی کا کچھ نہ کچھ اثر ہو جانا

Marfat.com

کوئی بڑی بات نہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ آمیزش ارادۃً ہی ہو۔ غیر ارادی طور پر غیر محسوس انداز سے اس کا اثر اس میں ضرور آجائے گا۔ ارباب جرح و تعدیل نے یہ ضرور کیا کہ ایک حدیث میں جس قدر راویوں کا سلسلہ آتا ہے ان کے متعلق بڑی کدوکاوش سے یہ تحقیق[۱] کی کہ وہ ثقہ تھے، پرہیزگار تھے، متقی تھے لیکن یہ امر بالکل بدیہیات سے ہے کہ ایک شخص کا متقی و پرہیزگار ہونا اس بات کے لئے مستلزم نہیں کہ اس کی یادداشت بھی اچھی ہو، اور اگر یادداشت بھی درست ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں حقائق و معارف کے سمجھنے کی کماحقہٗ استعداد ہو اور پھر انہیں بعینہٖ اسی طرح، لیکن اپنے الفاظ میں آگے منتقل کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جائے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے کوئی عقیدہ جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ اپنے گردوپیش نظر دوڑائیے، اور ان لوگوں کو جنہوں نے عمر بھر جھوٹ نہ بولا ہو، صوم و صلوٰۃ کے شدت سے پابند ہوں، متقی اور پرہیزگار بھی ہوں اور اس کے بعد پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ ان میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن میں حقائق کو سمجھنے اور سمجھ کر دوسروں تک منتقل کرنے کی استعداد بھی ہے۔ خود یہ حقیقت کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو اسکے اپنے الفاظ میں محفوظ رکھنے کا اس قدر محکم انتظام فرمایا اس امر کی دلیل ہے کہ دین کے معاملہ میں صرف مفہوم کا آگے منتقل ہوتے جانا

[۱] اسے بھی پیش نظر رکھئے کہ دو تین سو سال کے بعد یہ فیصلہ کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہو گا کہ کون ثقہ تھا اور کون غیر ثقہ۔

Marfat.com

قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ اس قسم کی چیز کبھی یقینی نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ آیتِ قرآنی کو پڑھتے ہیں تو پورے حزم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ قال اللہ تعالیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا) لیکن جب کوئی حدیث بیان کی جاتی ہے تو اس کے بعد یہ الفاظ دُہرائے جاتے ہیں کہ "او کما قال رسول اللہ" (یعنی یوں، یا جیسے رسولؐ اللہ نے فرمایا ہو) یہ چیز بعد کی وضع کردہ نہیں۔ بلکہ خود صحابہؓ کا بھی یہی انداز تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تذکرہ میں مذکور ہے کہ وہ جب قال رسول اللہ کہتے تھے تو کانپ اُٹھتے تھے اور کہتے تھے: اس طرح یا اس کے مثل، یا اُس کے قریب، یا، یا (مسند دارمی) حضرت عمرؓ اسی خوف سے حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کہ کہیں مجھ سے حدیث کی روایت کرنے میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔ (انساب الاشراف از بلاذری) یہ چیزیں اس پر شاہد ہیں کہ آج حدیث کو دین ماننے والوں کو بھی اس امر کا یقین نہیں ہوتا کہ رسولؐ اللہ نے یہی فرمایا تھا یا کچھ اور، اسی لئے ان کے ہاں بھی احادیث کو اقوال رسولؐ اللہ (حضورؐ کی باتیں) نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اقوال منسوب الی الرسول کہا جاتا ہے یعنی وہ باتیں جو جمع حدیث کے وقت رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ کہئے کہ ایسی چیز کبھی یقینی کہلا سکتی ہے؟ اور جب یہ اس قدر ظنّی ہے تو پھر دین کیسے بن سکتی ہے؟

Marfat.com

وضع حدیث

یہاں تک تو ہم نے اس مفروضہ کے ماتحت لکھا ہے کہ جو کچھ راویوں نے بیان کیا۔ اس میں انہوں نے دانستہ کسی قسم کی تحریف نہیں کی۔ جس چیز کو دیانتداری سے سمجھا کہ رسول اللہؐ کی طرف سے آئی ہے اسے اپنی سمجھ کے مطابق دیانتداری سے آگے منتقل کر دیا۔ لیکن اس کے بعد اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ اس اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ہزاروں ایسے منافق پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے لباس میں اپنی ظاہرداری کے تقویٰ اور ثقاہت کا سکہ جما کر لاکھوں حدیثیں وضع کیں اور انہیں ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کر کے آگے منتقل کر دیا۔ ان میں بعض کی منافقت کا پردہ چاک ہو گیا اور انہوں نے اپنی ان خبیثانہ حرکات کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن کتنے ایسے ہوں گے جن کا راز افشا نہ ہو سکا۔ پھر اتنا ہی نہیں۔ ہزاروں ایسے مسلمان تھے جو نہایت نیک نیتی سے اس لئے حدیثیں وضع کرتے تھے کہ لوگوں میں دین کا شوق پیدا ہو۔ مثلاً کسی بات کو انہوں نے اچھا سمجھا اور بجائے اس کے کہ اسے اپنی طرف سے کہیں اسے جناب رسول اکرمؐ کی طرف منسوب کر کے پیش کر دیا کہ اس کی قیمت بڑھ جائے اور اثر زیادہ ہو۔ اس قسم کی وضع شدہ احادیث کا ٹھکانا ہی نہیں (تفصیل کے لئے موضوعات ملا علی قاری دیکھئے) ارباب جرح و تعدیل نے معیار ثقاہت و تقویٰ اور پرہیزگاری قرار دیا تھا۔ اس قسم کے واضعین حدیث کے تقویٰ

Marfat.com

و پرہیزگاری میں کسے شبہ تھا۔ لہذا اُن کی ثقاہت مسلّم تھی۔ یہ چیزیں بھی دین بن گئیں۔ آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم سے پیشتر کی تمام کتب سماوی کو قرآن نے ظنی اور قیاسی قرار دے کر ناقابلِ اعتبار ٹھیرایا ہے تو اس کی یہی وجوہات ہیں۔ اول تو وہ ان الفاظ میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں جن میں وہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ اصل صحائف کے ضائع ہو جانے کے بعد اُن کے جامعین نے ان صحائف کو اِدھر اُدھر کی روایات کی بناء پر اکٹھا کیا تھا۔ پھر اُن میں وہ روایات بھی شامل ہوگئی تھیں جو لوگوں نے اس دوران میں وضع کی تھیں۔ نیز وہ کچھ بھی جو خود ان کے اربابِ مذاہب احبار و رُہبان نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ان میں شامل کر دیا تھا۔ اگر کتب سابقہ کا کوئی نسخہ جو اس طرح مُدوّن ہُوا تھا قرآن کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں قرار پا سکتا تو فرمائیے کہ احادیث کے مجموعے، جو بالکل اسی طرح سے مُرتّب ہوتے ہیں، کس طرح مستند قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ اس میں شُبہ نہیں کہ احادیث کے متعلق اربابِ جرح و تعدیل نے بڑی جانچ پڑتال کی۔ لیکن یہ تمام کوششیں انسانی تھیں۔ ان حضرات کی کوششیں لائقِ ہزار تحسین سہی، لیکن اُن کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ انہوں نے اپنے سے پیشتر سینکڑوں برسوں کے انسانوں کے متعلق تحقیق و تفتیش کے بعد دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا تھا، ان حضرات کو خدائی صفات کا حامل سمجھ لینا ہے۔ کتبِ احادیث

Marfat.com

کے متعلق زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تاریخ کی دوسری کتابوں سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں لیکن بالآخر یہ ہیں تو انسانی کارنامے۔ خُدا کی حفاظت کی ذمہ داری تو اُن کے ساتھ نہیں۔ اب جامعین حدیث کو اور علماء جرح وتعدیل کو تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی ہر بات کو جُوں کا تُوں تسلیم کر لینا اُن کو اُن کی بشریت کی سطح سے اُوپر لے جانا ہے، اور حضرات رواۃ کے متعلق، خواہ وہ کتنے ہی ثقہ اور عدول کیوں نہ قرار دیئے گئے ہوں، یہ عقیدہ رکھنا کہ اُن سے غلط بیانی یا مفہوم کو غلط سمجھنے یا غلط ادا کرنے کا امکان ہی نہ تھا اُن کو معصوم اور منزہ عن الخطا قرار دینا ہے۔ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثیں اکٹھی کیں، یعنی جو لوگ اُن کے سامنے موجود تھے اُن سے سُنیں اور اس کے بعد اپنی بصیرت کے مطابق ان میں سے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر مُسترد قرار دے دیا اور بقایا تین ہزار کے قریب اپنی کتاب میں درج کرلیں۔ لیکن غور فرمائیے کہ امام بخاری کے پاس کون سی سند تھی جس کے مطابق انہوں نے جن تین ہزار احادیث کو اپنے مجموعے میں داخل کر لیا ہے ان میں کسی شک وشُبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ کتنے ہی بڑے عالم سہی، تھے تو بالآخر انسان۔ اور ایک انسان کے متعلق سمجھ لینا کہ اس کی تحقیق کا نتیجہ ایسا ہے کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور وہ تنقید کی حد سے بالا ہے

Marfat.com

سوائے شخصیت پرستی کے اور کیا ہے۔

ثقاہت کا فیصلہ

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ وہ ثقہ تھا یا نہیں تو یہ فیصلہ کتنا ہی بے لاگ کیوں نہ ہو اس میں عام طور پر رجحاناتِ قلبی کا شائبہ آجائے گا اور قلبی رجحانات میں عقیدے کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ امام بخاری کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں، اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امام اعظم کو ثقہ نہیں قرار دیتے۔ پھر یہیں تک بس نہیں، چونکہ امام اعظم کوفہ کے رہنے والے تھے، اس لئے تمام کوفہ والے غیر معتبر، ناقابلِ روایت حدیث قرار پاگئے۔ اور کوفہ چونکہ عراق میں ہے اس لئے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے اور فیصلہ کر دیا کہ عراق والوں کی سَو (۱۰۰) حدیثوں میں ننانوے (۹۹) چھوڑ دو۔ جو ایک لو تو اُسے بھی مشتبہ ہی سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدے کے اختلاف کی بنا پر دو جلیل القدر امام یعنی امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتم نے خود امام بخاری کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے اور اُن سے روایت ترک کر دی ہے۔ بخاری اور مسلم کی کتابوں کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلمؒ امام بخاریؒ کو مختل الحدیث قرار دیتے ہیں۔ ان ائمہ علوم کی اس قسم کی باہمی چشمک کی بے شمار مثالیں کتب روایات میں ملتی ہیں۔ عقائد کے

Marfat.com

اختلاف سے احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے اختلاف کا سب سے بڑا مظاہرہ ہمارے سُنّی اور شیعہ جماعتوں کا وجود ہے۔ سُنّی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلہ روایت تابعینؒ و صحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیم ان مجموعوں میں جناب نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس سے بہت ہی مختلف تعلیم احادیث کے ان مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں۔ ان کا سلسلہ روایت بھی اسی طرح تابعینؒ وصحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سُنّی حضرات) تو یہ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ وہ بزرگانِ دین جو ان احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں داخل ہیں وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ اور معتبر ماننا پڑے گا۔ اب صورتِ معاملہ یوں ہوتی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث اُمّت کو ملیں جو سُنّی حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ کے ہاں صحیح ہیں، اور دونوں آپس میں ٹھیریں متناقض۔ اب کہیئے کہ کون سی تعلیم رسول اللہؐ کی قرار دی جاتے اور اسے جزو دین سمجھا جائے اور کون سی غلط! اگر کسی راوی کے ثقہ ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ارباب جرح وتعدیل یا جامعین احادیث کا ہم مسلک بھی ہو تو یہ صاف پارٹی بازی ہے، انصاف نہیں ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو جماعت آپ کی

Marfat.com

ہم مسلک نہ ہو اس میں سب کے سب چھوٹے اور غیر معتبر ہوں۔ ایک چیز اور بھی دلچسپ ہے۔ خود امام بخاری (اور دوسرے جامعین احادیث) جن بزرگوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں اور ان کی روایات مردود ٹھیرا لیتے ہیں خود ان ہی کی روایات سے اپنے مجموعوں میں احادیث درج کر دیتے ہیں۔ دیکھئے میزان الاعتدال از علامہ ذہبی و تدریب الراوی وغیرہ۔

یہ تو ہیں خارجی شہادات جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احادیث نہ خود نبی اکرمؐ کے نزدیک جزوِ دین تھیں نہ صحابہ کبارؓ نے انہیں ایسا سمجھا۔ اور احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں وہ رسول اکرمؐ کے الفاظ بھی نہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر داخلی شہادات خود ان مجموعوں کے مشمولات contents ہیں ان میں کس قسم کی باتیں لکھی ہیں اُن کے ذکر سے میری رُوح کانپتی ہے، ہاتھ میں قلم لرزتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ

داخلی شہادت

میرا یہ بیان آپ کو بے حد تعجب انگیز اور حیرتناک معلوم ہوگا اور ہونا بھی چاہیئے اس لئے کہ ہمارے دلوں میں ان مجموعوں کی عزت و عظمت قرآن کریم کے درجہ تک کی ہے۔ لہٰذا ان کے متعلق ایسی بات یقیناً تحیّر انگیز ہوگی۔ لیکن میں آپ سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ آپ میری سنیئے اور نہ کسی اور کی، بلکہ صحیح بخاری لے کر خود مطالعہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں نے کیا لکھا ہے؟ مجھے معلوم ہے

Marfat.com

کہ آپ سے کہا جائے گا کہ ذرا سوچئے تو سہی امام بخاری علیہ الرحمۃ اتنے پائے کے امام، پھر ان کے بعد ایک ہزار سال کے عرصے میں کتنے بڑے جلیل القدر علماء عظام و بزرگان کرام ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا ہے۔ کیسے ایسی کتاب میں (پناہ بخدا) اس قسم کی بات ہو سکتی ہے۔ اس کے جواب میں، میں پھر یہی عرض کروں گا کہ ان بزرگان سلف (علیہم الرحمۃ) کی عزت و تقدیر بجا اور درست۔ لیکن جب ہمارے پاس بخاری شریف موجود ہے تو ہم اسے خود کیوں نہ ایک نظر دیکھ لیں۔ آج کل تو بخاری شریف کا اُردو ترجمہ بھی مل سکتا ہے۔ آپ عربی نہیں جانتے تو اُردو ترجمے ہی کو دیکھ لیں اور اسکے بعد علی وجہ البصیرت فیصلہ فرمائیں کہ میں نے درست لکھا ہے یا نہیں۔ آپ کو اس میں ایسی باتیں ملیں گی جنہیں آپ کبھی جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس ذات اقدسؐ و اعظم کی طرف جو انسانیت کے معراج کبریٰ کا مظہر اتم تھی۔ وہ ہستی گرامی مرتبت (فداہ ابی و اُمّی) جو علم و ایقان کے افق اعلیٰ پر جلوہ افروز تھی۔ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ اس فخر موجودات رحمۃ اللعالمینؐ کی ذات عظمت مآب کی طرف کس کس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ مجموعے ظنی ہی سہی لیکن دنیا میں کتنی ظنی باتیں

Marfat.com

ہیں جنہیں ہم صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور ہمارا روزمرّہ کا کاروبار ہی اس بات پر چلتا ہے۔ دیکھئے آپ تاریخ کے واقعات کو مانتے ہیں حالانکہ وہ بھی ظنّی ہوتے ہیں۔ آپ اخبارات میں خبریں پڑھتے ہیں حالانکہ وہ بھی یقینی نہیں ہوتیں۔ پھر احادیث سے کیا چڑ ہے کہ آپ انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ ظنّی ہیں۔

دین ظنّی نہیں ہو سکتا

یہ دلیل بظاہر معقول نظر آتی ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ ان دونوں باتوں میں فرق کتنا بڑا ہے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تاریخ یا اخبارات ہمارے لئے دین کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میرا جی چاہے ایک واقعے کو صحیح تسلیم کروں اور اگر اس کے خلاف میرے پاس دلائل ہوں تو یہ کہکر رَد کر دوں کہ مجھے اس کی صحت پر شبہ ہے۔ برعکس اس کے احادیث ہمارے لئے دین قرار دی جاتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید کی حد سے بالاتر ہیں۔ اگر مجھے اُن کے متعلق ذرا سا بھی تردّد پیدا ہو جائے تو ایمان کی خیر نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔ مثلاً تاریخ میں لکھا ہو کہ فلاں بادشاہ نے فلاں مقام پر جھوٹ سے کام لیا۔ میں چاہوں تو اُسے صحیح تسلیم کروں نہ چاہوں تو اُسے مسترد کر دوں۔ نہ مجھ پر اس باب میں کوئی پابندی عائد ہوتی ہے نہ میرے ایمان پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ لیکن جب بخاری شریف کی یہ حدیث میرے سامنے

Marfat.com

آتے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا" تو چونکہ حدیث کو جزوِ دین قرار دیدیا گیا ہے اس لئے اس کا تسلیم کرنا مجھ پر لازم ہوگیا۔ اگر صحیح تسلیم نہیں کرتا تو حدیث کے متعلق شک کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہوں۔ اور اگر اس کی صحت پر ایمان لاتا ہوں تو خدا کے ایک برگزیدہ نبیؐ کو (معاذ اللہ) جھوٹا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ یا مثلاً اخبار میں آپ دیکھتے ہیں کہ فلاں شہر میں کسی شخص نے ایک دوسرے شخص کی ناک کاٹ ڈالی، تو اسے ماننا نہ ماننا آپ کے ایمان کا جزو نہیں لیکن جب آپ بخاری شریف کی اس حدیث کو پڑھیں گے کہ "جب ملک الموت حضرت موسیٰؑ کی روح قبض کرنے کے لئے آئے تو حضرت موسیٰؑ نے ان کے ایک ایسا تھپیڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی"۔ تو آپ کو اس واقعے کو صحیح ماننا پڑے گا کیونکہ اس میں شک کرنے سے آپ دین میں شک کر رہے ہیں۔ اس سے آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ دُنیا کی دوسری ظنّی چیزوں کے تسلیم کرنے میں اور ایک ایسی ظنّی چیز کے تسلیم کرنے میں جسے آپ کے دین کا جزو قرار دیا گیا ہو، کتنا بڑا فرق ہے۔ ہم خود بھی کہتے ہیں کہ چونکہ احادیث یقینی نہیں ظنّی ہیں اس لئے یہ دین نہیں قرار پاسکتیں۔ ان کی حیثیت تاریخ کی ہے اور تاریخ تنقید کی حد سے بالاتر نہیں ہوتی۔

رسُول کی اطاعت | اس مقام پر یہ سوال اُبھر کر ہمارے سامنے

Marfat.com

آجاتا ہے کہ جب قرآن کریم میں "خدا اور رسول" کی اطاعت کا حکم ایسی تاکید سے آیا ہے تو اگر، احادیث ظنّی ہیں تو پھر رسول کی اطاعت کس طرح سے کی جاتی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ایک مرتبہ پھر "خدا اور رسول" کے اس قرآنی مفہوم کو سامنے لانا ہوگا جو میرے متعدد مضامین میں آپ کی نگاہوں سے گزر چکا ہے۔[1] یعنی "خدا اور رسول" سے مُراد وہ مرکز ملت ہے جو دنیا میں خدائی قوانین نافذ کرے۔ رسول اللہ، جہاں ایک رسُول تھے (یعنی خدا کی وحی کو انسانوں تک پہنچانے والے) وہیں آپ اس حکومتِ خداوندی کے اوّلیں مرکز بھی تھے۔ لہٰذا آپ کی اطاعت، جو بہ حیثیت امیرِ ملت اور مرکزِ امت کی جاتی تھی "خدا اور رسولؐ کی اطاعت تھی حضورؐ کے بعد مرکزِ ملت خلیفۃ الرسول قرار پا گئے۔ اُس وقت "خدا اور رسول" کی اطاعت، خلیفۃ المسلمین کی اطاعت تھی۔ یعنی حضرت ابا بکر صدیق کے فیصلوں کی اطاعت جو آپ بہ حیثیت امیرالمؤمنین صادر فرماتے تھے، عین اطاعت "خدا و رسول" تھی۔ یہی سلسلہ آگے منتقل ہوتا رہا: تاآنکہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور پھر سرے سے یہ شیرازہ ہی منتشر ہوگیا۔ اس وقت "خدا اور رسول" کی اطاعت کا صحیح مفہوم بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اب خدا کی اطاعت کا مفہوم لیا گیا قرآن کی اطاعت اور رسولؐ کی

---

[1] ان تفاصیل کے لئے دیکھئے "اسلامی نظام" شائع کردہ طلوع اسلام

Marfat.com

اطاعت کا مفہوم احادیث کا اتباع۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مفہوم مسلمانوں کے دورِ تشتت وانتشار کی پیداوار ہے۔ نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ میں "خدا اور رسول" کی اطاعت سے مفہوم مرکزِ ملت کے فیصلوں کی اطاعت تھا اور بس! قرآن کریم نے جن احکامات کی تفاصیل خود بیان کر دی تھیں ان میں نہ رسولؐ کو ردّ و بدل کا حق حاصل تھا نہ حضورؐ کے جانشینوں کو۔ لیکن جن معاملات کے متعلق قرآن کریم نے محض اصولی احکام دیئے ہیں ان کی جزئیات مرتب کرنے کا کام مرکزِ ملت کے ذمہ تھا۔ ان جزئیات کا قرآن کریم میں بیان نہ ہونا اور جو جزئیات رسول اللہؐ نے مرتب فرمائی تھیں ان کا قرآن کی طرح محفوظ نہ رکھنا اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ ان جزئیات کو غیر متبدل اور اٹل قرار دینا نہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت۔ خدا اور اس کے رسول کے نزدیک ان میں مختلف زمانوں میں، بہ اقتضائے حالات، ردّ و بدل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ردّ و بدل انفرادی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مرکزِ ملت ہی ایسا کر سکتا ہے۔ آج ہم میں مرکزِ ملت علیٰ منہاج نبوت موجود نہیں اس لئے ہماری زندگی بھی اسلامی نہیں اور اسی لئے طرح طرح کے اعتراضات اور شبہات ہمارے قلب و دماغ کے لئے وجہ پریشانی اور باعث تردّد بن رہے ہیں۔ مرکزِ ملت قائم ہو جائے تو ان تمام امور کا تصفیہ خود بخود ہو جائے

Marfat.com

یہ مرکز قرآن کو اپنے سامنے رکھے گا۔ پھر اُن امور کے لئے جن کی جزئیات قرآن نے بیان نہیں کیں، اپنے پیش رو مراکز ملت کے فیصلوں کا مطالعہ کرے گا اور اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ان پر غور و خوض کرنے کے بعد، اگر وہ انہیں علیٰ حالہ رکھنا چاہے گا تو اسی طرح رہنے دے گا اور اگر کہیں ردّ و بدل کی ضرورت سمجھے گا تو ایسا بھی کر دے گا ملت کے لئے خدا اور رسول کی اطاعت مرکز کے ان فیصلوں کی اطاعت کا نام ہوگا۔ چونکہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یہ قرآنی نظامِ زندگی اوجھل ہو چکا ہے اس لئے مرکز کی صحیح پوزیشن بھی ان کے سامنے نہیں رہی اور اسی لئے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا صحیح مفہوم بھی بآسانی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسکا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آجائے تو احادیث کا صحیح مقام بھی سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ نے کیوں احادیث کے مجموعے مرتب کر کے امت کو نہیں دیئے تھے۔ وہ امت کو صرف دین دینا چاہتے تھے اور دین خدا کی کتاب کے اندر ہے یا ان جزئیات کے اندر جو کتاب اللہ کے اصولوں کے تحت، ہر زمانے میں، قرآنی احکام نافذ کرنے والی حکومت وضع اور نافذ کرے۔ لہٰذا اگر یہ کسی طرح ثابت بھی کر دیا جائے کہ فلاں روایت یقینی طور پر سچی ہے تو بھی اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ حضورؐ کے زمانہ مبارک میں دین کے فلاں گوشہ پر کس طرح عمل کیا گیا تھا۔ اگر ہمارے زمانے کا مرکزِ حکومت قرآنی سمجھے کہ اس عمل میں کسی

Marfat.com

ردّوبدل کی ضرورت نہیں تو اسے علیٰ حالہ رائج کردے اور اگر سمجھے کہ ہمارے زمانے کے اقتضاآت اس میں ردّوبدل چاہتے ہیں تو اس میں ردّوبدل کردے ۔ یہ ہے احادیث کی صحیح دینی حیثیت ۔

حدیث کی صحیح پوزیشن تجزیہ:۔ تصریحاتِ بالا سے یہ امور واضح ہو گئے ہوں گے کہ ۔

(۱) دین یقینی ہونا چاہیئے، ظنّی شے دین نہیں بن سکتی ۔

(۲) یقینی چیز قرآن کریم ہے جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا اور نبی اکرمؐ نے اس کے الفاظ محفوظ کر کے اسے اُمت کے پاس چھوڑا ، اور پورا پورا اطمینان کر لیا کہ اس کے الفاظ کتاب کے اندر اور حفّاظ کے سینے میں محفوظ ہو چکے ہیں حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے اسی قرآن کی حفاظت اور نشر و اشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا ۔

(۳) قرآن کریم کے علاوہ نبی اکرمؐ نے کسی چیز کو لکھوایا نہ یاد کرایا ، نہ سنا ، نہ اس کی صحت کی کوئی سند عطا فرمائی اور حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے بھی نہ احادیث کا کوئی مجموعہ تیار کرایا نہ کوئی جماعت پیدا کی جو انہیں یاد کرے ۔ برعکس اس کے ایسی شہادتیں پائی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ اور ان کے جانشینوں نے اس کی مخالفت کی ۔

(۴) جب لوگوں کو صدرِ اولیٰ کی تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو بعض حضرات کو اس امر کا خیال پیدا ہوا کہ خاص وہ اقوال و احوال جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، انہیں الگ

Marfat.com

کتابوں میں جمع کر دیا جائے ان ہی کا نام کتب احادیث ہے۔

(۵) احادیث کی وہ کتابیں جنہیں مستند سمجھا جاتا ہے (یعنی صحیحین) حضورؐ کے قریب دو ڈھائی سو برس کے بعد مدوّن ہوئیں (صحاح ستہ میں سے اوّلین کتاب بھی ڈیڑھ سو برس بعد مدوّن ہوئی)۔ ان کا ذریعہ تدوین وہ روایات تھیں جو اس وقت لوگوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

(۶) یہ روایات قرآن کریم کی طرح لوگوں میں لفظاً منتقل ہو کر نہیں آئی تھیں۔ بلکہ ان کا مفہوم منتقل ہو کر آتا رہا۔

(۷) حضرات جامعین احادیث کے بعد ارباب جرح و تعدیل نے یہ فیصلے کئے کہ فلاں فلاں راوی معتبر ہے اور فلاں فلاں غیر معتبر۔ یعنی انسانوں نے اپنے سینکڑوں برس پہلے کے انسانوں کی ثقاہت کے متعلق فیصلے کئے اور انہی فیصلوں کے مطابق احادیث صحیح و ضعیف قرار پائیں۔

(۸) ان مجموعوں میں ایسی باتیں موجود ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور انبیاء کرامؑ کی شان میں طعن پایا جاتا ہے، جن سے بصیرت ابا، اور عقل سلیم بغاوت کرتی ہے اور جن میں ایسی ایسی چیزیں ملتی ہیں جنہیں آپ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کرنے کی کبھی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اس کے لئے آپ زیادہ نہیں تو صرف ایک صحیح بخاری کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ یہ درست ہے یا نہیں۔

(۹) یہ ہیں وہ مجموعے جنہیں قرآن کریم کے ساتھ دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے، بلکہ یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے کہ "احادیث قرآن کریم کی

Marfat.com

اتنی محتاج نہیں جتنا قرآن احادیث کا محتاج ہے۔" (امام اوزاعی) اور یہ کہ "احادیث قرآن پر قاضی ہیں۔" (امام یحیٰی) یعنی اگر قرآن اور احادیث میں تعارض ہو تو جو فیصلہ احادیث دیں وہ قابلِ قبول ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حدیث کے صحیح ہونے کا یہ اصول بھی قرار دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو لیکن احادیث کو دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ اصول تبرکاً داخل رہا۔ عملی طور پر اس سے کام نہیں لیا گیا۔ عملاً یہ اصول کارفرما رہا کہ احادیث کے راوی کیسے ہیں۔ یعنی اگر ایک حدیث کا سلسلۂ اسناد (راویوں کا سلسلہ) معتبر قرار دیدیا گیا ہو تو وہ حدیث صحیح قرار پا جائے گی۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ

(۱) یقینی چیز قرآن مجید ہے اور دین اسی کے اندر ہے۔

(۲) احادیث کی حیثیت دین کی تاریخ کی ہے۔ لہٰذا یہ مجموعے تنقید کی حد سے بالاتر نہیں۔ جس طرح امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے قریب تین ہزار کا انتخاب فرما کر بقایا مسترد کر دی تھیں۔ اسی طرح ان کے مجموعے سے بھی ایسی احادیث الگ کی جا سکتی ہیں جو دین کے معیار پر صحیح نہیں اترتیں۔ اس لئے کہ یہ تسلیم کر لینا کہ راویوں نے کسی ایک بات کو صحیح نہیں سمجھا اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ ایک ایسی چیز کو ذاتِ رسالتمآب کی طرف منسوب کر دیا جائے جو اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ اس قسم کی تنقید و تنقیح کے بعد احادیث کے ان مجموعوں سے ہم دین کے سمجھنے میں اور جزئیات کی تشکیل میں استفادہ کر سکتے ہیں۔ دین، یہ پھر بھی قرار نہیں دی جا سکتیں۔

Marfat.com

(۳) یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس حقیقت پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرمؐ قرآن ہی کا اتباع کرتے تھے اس لئے حضورؐ کا کوئی قول یا عمل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ان دو اصولوں کے بعد، احادیث کو پرکھنے کا نہایت عمدہ معیار ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو حدیثیں قرآن کریم کے مطابق نہ ہوں اُن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کو رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کے راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ قرار دیئے جائیں۔ جو احادیث اس طرح پرکھی جائیں اُن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے ہاں کی قابلِ اعتماد تاریخ دین ہے۔

(۳)

پیر پرستی

اس وقت تک ہم نے شخصیت پرستی کے جس قدر مظاہر پیش کئے ہیں ان میں ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ انہیں اپنی اطاعت کے لئے کسی نہ کسی سند کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اب ہم شخصیت پرستی کے ایک ایسے گوشے کی طرف آتے ہیں جہاں مُطاع اور مطیع کے لئے کسی قسم کی سند کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ گوشہ پیر پرستی کی اندھی اطاعت اور انسانی غلامی کا شدید ترین مظہر ہے۔ اس میں پیر کا ہر حکم، خدا کی طرح واجب التسلیم ہوتا ہے۔ نہیں! بلکہ خدا کے حکم سے بھی زیادہ۔ کیونکہ اگر پیر کا حکم خدا کے حکم کے خلاف ہوتا ہے تو

Marfat.com

اطاعت پیر کے حکم کی ہوتی ہے۔ خدا کی نہیں۔ اس لئے کہ پیر پرستی کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ "ہر روٹھے گر دمیل دے گرو روٹھے میلے کون، اگر خدا ناراض ہو جائے تو اُسے مرشد منا سکتا ہے لیکن اگر مرشد روٹھ جائے تو اسے کون منا سکتا ہی، لہٰذا اگر کبھی خدا اور مرشد میں سے ایک کو رکھنے اور دوسرے کو چھوڑنے کی مجبوری لاحق ہو جائے تو "مسلک راہِ طریقت" یہ ہے کہ "ہر تیاں گرونا ہیں تیاگوں" (خدا کو چھوڑ دینا چاہیئے، مرشد کو نہیں چھوڑنا چاہیئے)

مُرشد کے پاس اپنے احکام کی اطاعت کے لئے سند صرف "علم لدنی" کی ہوتی ہے جو علم و شہادت کی تمام شرائط سے بے نیاز ہے۔

علم لدنی

مرشد اپنا علم براہِ راست "خدا اور رسول" سے حاصل کرتا ہے۔ اور یہ وہ علم ہے جو نہ خدا کی کتاب میں ہے اور نہ رسول اللہ کی طرف منسوب کردہ سُنّت میں۔ وہ قرآنی آیات کا مفہوم بھی ایسا بیان کرتا ہے۔ جو نہ عربی زبان کی رُو سے درست ہو اور نہ ہی تعلیم قرآن کے مطابق۔ اس مفہوم کے لئے سند، اس کا کشف ہے جس کے لئے کسی دلیل و بُرہان کی ضرورت نہیں جب وقت آپ نے کسی کی بیعت کر لی بس اس کے بعد علم و عقل کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی آپ پر حرام ہو گیا۔ اب پیر کا ہر حکم بلا سند، خدا کا حکم ہے۔ اس کے ایک لفظ پر بھی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ لب کشائی تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ

Marfat.com

پیر دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں تک سے حاضر و غائب واقف ہے۔ وہ تمام خدائی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر وہ ناراض ہو گیا تو دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہو گئیں۔ اس کے بعد کہیں ٹھکانا نہیں، کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر نہ کوئی انسان اس کی مدد کر سکتا ہے اور نہ خدا ہی۔ ہم اس وقت نہ تو تصوّف کی تاریخ لکھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ بتانا مقصود ہے کہ خود تصوّف ہی کس قدر غیر اسلامی نظریہ ہے۔ ہم اس وقت صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام، جو انسان کو ہر قسم کی انسانی اطاعت سے آزاد کرنے آیا تھا، اسی اسلام کے نام پر کس طرح انسانی غلامی کی شدید اور بدترین اقسام کو عینِ دین بنا لیا گیا ہے۔ قرآن یہ کہنے آیا تھا کہ اور تو اور، کسی رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ وہ خود بھی احکامِ خداوندی کی اطاعت کراتا ہے۔ لیکن وہی اسلام، پیر پرستی میں ایسا ممسوخ ہو گیا کہ پیر کے کسی حکم کے لئے نہ قرآن کی ضرورت ہے نہ عقل و بصیرت کی دلیل کی حاجت۔ ملوکیت کا استبداد انسان کے جسم تک ہی محدود ہوتا ہے لیکن پیر پرستی کے استبداد کو دیکھئے کہ یہ دل و دماغ پر مستولی، رگ و ریشہ میں اترا ہوا اور قلب و روح پر چھایا ہوا ہے۔ اگر پیر کی عظمت کے خلاف مرید کے دل میں بھی کوئی خیال گزرتا ہے تو وہ ڈرتا ہے، لرزتا ہے، کانپتا ہے۔ انسان ملوکیت کی غلامی سے ہر

Marfat.com

وقت بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ اگر پیر کسی کو اپنے آستانے سے دُور ہوجانے کا حکم دیتا ہے تو وہ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، دُنیا بھر کی سفارشیں لاتا ہے، سجدے کرتا ہے، ناک رگڑتا ہے کہ حضور! مجھے راندۂ درگاہ نہ بنائیے، میں دنیا اور آخرت میں کہیں کا نہیں رہوں گا! میں تباہ ہوجاؤں گا۔ میں برباد ہوجاؤں گا۔ مومن کی شان یہ تھی کہ اسے دنیا میں خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہ ہو۔ قرآن نے خوف کا نشیمن مشرک کا قلب بتایا تھا لیکن اسی قرآن کے ماننے والوں کی یہ کیفیت ہوگئی کہ وہ خود اپنے جیسے انسانوں کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (۷/۱۹۴) "جنہیں تم خدا سے ورے پکارتے ہو، وہ تو خود تمہارے جیسے انسان ہیں" لیکن یہ انہیں اپنے جیسے انسان نہیں بلکہ خدا مانتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ نہیں یہ غلط ہے، پیر کو خدا نہیں مانا جاتا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ اگر اسے لفظاً خدا نہیں کہا جاتا تو کیا معناً اسے خدا نہیں مانا جاتا؟ خدا نے کہا تھا کہ دُنیا میں کسی کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت حاصل نہیں۔ پیر کے متعلق یہ ایمان ہوتا ہے کہ نفع اور نقصان کی ساری طاقتیں اس کے قبضے میں ہیں۔ حتیٰ کہ وہ انسانی تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ پیر پرستی کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے۔ اگر یہ عقیدہ

Marfat.com

نکال دیا جائے کہ پیر کو نفع و نقصان کی قدرت حاصل ہے تو پیر پرستی آج ختم ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم پیر کی اطاعت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا تک پہنچا دے لیکن دیکھئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جب مشرکین سے پوچھئے کہ تم اپنے پیروں کی پرستش کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم انہیں خدا نہیں مانتے بلکہ انہیں تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۔ (۳۹/۳)

جو لوگ اللہ سے ورے ہی لوگوں کو اپنا کارساز بنا لیتے ہیں (جب ان سے پوچھئے تو وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی اطاعت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔

کہتے ہیں کہ ہم پیر کو معرفتِ الٰہی کا وسیلہ بناتے ہیں اور اس کے لئے یہ آیت بطور سند پیش کرتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ ۔ (۵/۳۵)

اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو ؛

حالانکہ یہی آیت ان کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے۔ اوپر کا حصہ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے۔ باقی حصہ اس وسیلہ کی تشریح کر رہا ہے کہ

Marfat.com

وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

یعنی اس کے راستہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ

یعنی تقربِ الٰہی کا حقیقی وسیلہ جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ ہے کہ راہِ حق میں، باطل کے خلاف جہاد کیا جائے نہ یہ کہ کسی انسان کا دامن تھام کر بیٹھ جاتے۔ خدا تک پہنچنے کے لئے انسانی توسل خالص شرک ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ (خدا کیا ہے! انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے، قربِ الٰہی کسے کہتے ہیں، اس سے انسان کے شعور میں کیا انقلاب آتا ہے۔ یہ تمام مباحث الگ ہیں۔ ان پر اس وقت بحث نہیں ہو سکتی[1]۔)

قرآن اللہ اور بندے کے درمیان کسی حاجب اور دربان کو جائز قرار نہیں دیتا۔ خدا ہر بندۂ مومن سے کہتا ہے کہ ادعونی استجب لکم تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ وہ کہتا ہے کہ "امن یجیب المضطر اذا دعاہ" وہ کون ہے جو کسی بے قرار کا جواب دیتا ہے؟ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے جو ایسا کر سکتا ہے؟

اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔

---

[1] ان تفاصیل کے لئے دیکھئے "اسباب زوال امت" اور "سلیم کے نام خطوط" کا مجموعہ: شائع کردہ طلوع اسلام۔

Marfat.com

اور جب میرے بندے میری بابت تجھ سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ ہر پکار سننے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارے۔

مرشد قرآن ہے

باقی رہا یہ کہ ہم رشد وہدایت حاصل کرنے کے لئے مرشد وہادی کی تلاش کرتے ہیں سو یاد رکھئے کہ ہدایت قرآن میں آچکی۔ ظاہر، باطن، شریعت، طریقت سب کچھ وہی ہے۔ خدا سے ملنے کا راستہ بھی وہی ہے جسے خدا نے صراط مستقیم کہا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں، کوئی چور دروازہ نہیں جس کے راستے کوئی دوسرا خدا تک لے جائے اور یہ راستہ صرف اسی طرح ملتا ہے کہ تمام انسانوں کی غلامی کا طوق اتار کر صرف خدا کی غلامی اختیار کرلی جائے یہی خود رسول اللہ نے کیا اور اسی کے کرنے کا حکم دیا۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ۔ (۳/۵۱)

میرا اور تمہارا رب وہی اللہ ہے۔ اسی کی غلامی اختیار کرو۔ یہ صراط مستقیم ہے۔

اس کے علاوہ اور کوئی "راز" نہیں جو حضور خفیہ خفیہ کسی ایک کو بتلا گئے ہوں کہ یہ چیز تبلیغ رسالت کے منافی تھی جس کے لئے حضور مامور تھے حضور کو ارشاد تھا کہ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ، یعنی جو کچھ تم پر نازل کیا جاتا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔ چنانچہ حضور نے یہ سب کچھ لوگوں

Marfat.com

تک پہنچا دیا اور آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اقرار بھی لے لیا کہ آپ نے سب کچھ پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ حضورؐ نے "مغز دین" عوام تک نہیں پہنچایا تھا بلکہ وہ چپکے چپکے خواص کو بتایا تھا جو پھر اسی طرح آگے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے[1]۔ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ (نعوذ باللہ) ذاتِ رسالتمآبؐ کے متعلق کیا خیال پیدا کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آتی اور یہ عقیدہ رکھے جا رہے ہیں کہ دین کا ایک حصہ (جو درحقیقت اصل دین ہے) حضورؐ نے لوگوں سے چھپا کر چپکے سے کسی کے کان میں کہدیا تھا اور وہ کانوں کان آگے چلا آرہا ہے۔ باقی رہی بزرگوں کی تعظیم تو بلاشبہ تمام وہ اسلاف جنہوں نے دنیا میں قوانینِ الٰہیہ کو قوتِ نافذہ بنا کر چلایا۔ عزت اور احترام کے مستحق ہیں۔ ان کی زندگیاں ہمارے لئے تقویتِ ایمان کا موجب ہیں، اس لئے کہ انہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ باطل کی تمام طاغوتی طاقتوں کے خلاف مسلسل جہاد سے کس طرح حق کا غلبہ قائم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ایک اللہ کا ہو کر سارے جہان کی غلامی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے تمام دنیا کی مخالفت کے باوجود بڑے بڑے کفر و الحاد کے مرکزوں میں قرآن کی روشنی راہ گم کردہ انسانوں

---

[1] اس عقیدے کے لئے بھی روایات ہی ذمہ دار ہیں۔

Marfat.com

تک پہنچائی، اور دنیا میں خدائی حکومت کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ ان کے اعمال صالحہ دنیا میں روشنی کے میناروں کی طرح محکم و استوار کھڑے ہیں۔ کہ حوادث زمانہ کی نامساعد موجیں آئیں اور اُن سے ٹکرا کر لوٹ جائیں۔

وکذالک نجزی المحسنین

لیکن تعظیم اور تعبد کے باریک فرق کو بھول جانے سے صحیح راستہ گُم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اُسے کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔

مُردہ پرستی

پیر پرستی کی غلامی کا طوق پیر کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی مملکت ابدی ہے۔ مرنے کے بعد وہ اسی طرح قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے جیسا کہ زندگی میں بلکہ اب اس کی گرفت پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے کہ اب وہ دربارِ خداوندی کا حاضر باش ممبر تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ عقیدہ "وصال بالحق" کی رُو سے تو وہ خدا میں مل کر خدا بن جاتا ہے۔ وہ تمام مُریدوں کے حالات سے باخبر ہوتا ہے، ہر ایک کی دُعائیں سُنتا ہے، ان کی مشکل کُشائی کرتا ہے، مصیبت میں بعض اوقات بنفس نفیس تشریف لا کر حاجت روائی کرتا ہے۔ غرضیکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہیئے تھا اب اس کی جگہ پیر صاحب کرتے ہیں۔ حالانکہ مُردوں کے متعلق قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ یوم بعث تک وہ کسی دُنیا والے کی سُننے اور جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔

Marfat.com

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا
مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ (۳۵/۱۴)

اور اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر بفرضِ محال سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے۔

ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ وہ کب قیامت کے لئے اٹھائے جائیں گے۔

"اور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں مُردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں، اور اتنی بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔" (۱۶/۲۰-۲۱)

ماضی پرستی

ہم نے جس قدر پرستشیں گنائی ہیں، اگر آپ بنظرِ عمیق دیکھیں گے تو ان میں ایک چیز بطور قدرِ مشترک نظر آئے گی، اور وہ ماضی پرستی ہے۔ یہ ہی ان تمام غلط عقائد کی اصل ہے۔ اسلام مستقبل کو درخشندہ و تابناک بنانے والا دین تھا لیکن انسانی دماغوں نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ تو بہر کیف انسانی مذہب[1] ہی ہو سکتا تھا جس کی رُو سے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج بڑا تاریک ہے اور گزشتہ کل بڑا روشن تھا۔ یہ کلجگ ہے اور وہ ست جگ تھا۔ آپ آج سے پیچھے ہٹتے جائیے اور ہر ایسے بزرگ کی تصنیف اٹھائیے جس کا عہد آپ

---

[1] مذہب اور دین کے فرق کے لئے دیکھئے "اسباب زوالِ اُمت"۔

Marfat.com

کے نزدیک بڑا مقدس اور نورانی تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی یہی گلہ کرتے دکھائی دیں گے کہ ہمارا زمانہ بڑا تاریک ہے اور گزشتہ زمانہ بڑا تابندہ تھا۔ تو ذہنِ انسانی کی کچھ افتاد ہی ایسی ہے، اور اسی افتاد کا نتیجہ ہے کہ جو شے گزشتہ زمانے سے متعلق ہو واجب التعظیم ہو جاتی ہے ائمہ پرستی، رواۃ پرستی، اسلاف پرستی، مُردہ پرستی، سب اسی ماضی پرستی کی مختلف شاخیں ہیں اور جب تک ماضی پرستی کا تخیّل صحیح نہ ہوگا، حقائق پرستی کبھی نہیں آئے گی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہو جائیں۔ ماضی ہمارے آبا و اجداد کی وراثت ہے ہم اس سے متمتع کیوں نہ ہوں۔ لیکن ماضی کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ہر ایک فن عہدِ ماضی میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور ایسا مکمل ہو گیا کہ اس میں کوئی نقص، کوئی کمی باقی نہیں رہی نہ اس پر اضافہ ہو سکتا ہے نہ ترمیم، نہ اس پر تنقید ہو سکتی ہے نہ تنقیح، یہ ہے ماضی پرستی۔ دِین قرآن کے اندر مکمل ہو گیا اور قرآن کتاب فطرت ہے جس طرح فطرت کے رازہائے سربستہ ذہنِ انسانی کے نشو و ارتقاء کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور فطرت کی کوئی شے کسی مقام پر بھی جا کر یہ نہیں کہہ دیتی کہ بس اب مجھ میں مزید تحقیق بیکار ہے، میرے سینے میں جس قدر گہر ہائے آبدار موجود تھے وہ سب باہر آ چکے ہیں، اسی طرح قرآن کریم کے حقائق بھی عقل انسانی کے ساتھ ساتھ جلوہ بار ہوتے جائیں گے۔

Marfat.com

اور چونکہ یہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے آخری کتاب ہے اس لئے جب تک دنیا میں انسان باقی ہیں، یہ اُن کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق سامانِ ہدایت دیتی چلی جائے گی۔ اسی اعتبار سے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کسی خاص ماحول میں مقیّد نہیں ہو سکتا۔ لیکن ماضی پرستی ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور یہی ہے وہ چیز جس سے دماغ پر برف کی سلیں رکھی جاتی ہیں، عقلیں معطل ہو جاتی ہیں، قوائے عمل مضمحل ہو جاتے ہیں، فکر و نظر کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ کبھی قدم اُٹھتے بھی ہیں تو مُنہ کا رُخ چونکہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے اس لئے ہر قدم منزل سے اور بعید ہو جاتا ہے۔ قومیں آگے بڑھتی ہیں اور یہ قوموں کے امام پیچھے جاتے ہیں۔ دُنیا اوپر کو اُبھرتی ہے اور یہ دنیا کے پیشوا نیچے کو جاتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں اتنی بوجھل زنجیریں ہیں کہ وہ آنکھیں اوپر اٹھنے ہی نہیں دیتیں۔ جن قوموں میں دین رسوم پرستی بن کے رہ گیا (اور یہ ماضی پرستی ہی کا دوسرا نام ہے) وہ قومیں کبھی اُبھر نہیں سکیں۔ انہوں نے کبھی اُبھرنا بھی چاہا تو چونکہ اُن کا اصل دین اُن سے گم ہو چکا تھا اس لئے انہیں سہارا دینے کی کوئی چیز نہ مل سکی۔ لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اُن کے خدا کی کتاب زندہ ہے۔ اور یہ قوم پھر مُردہ کی مُردہ۔ سچ ہے زمینِ شور پر ابرِ رحمت کیا گہرباری کرے گا۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔

Marfat.com

حقائق پرستی

آپ نے غور فرمایا کہ تمام پرستشیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس لئے پیدا ہوگئیں کہ مسلمانوں نے بھی دیگر مذاہب کے متبعین کی طرح، حقائق پرستی چھوڑ کر شخصیت پرستی اختیار کر لی۔ حالانکہ ان کے پاس حقائقِ ازلی کا مکمل دستور اپنی اصلی صورت میں موجود تھا اور انہیں اس کو چھوڑ کر کسی ظن وتخمین کے اتباع کی ضرورت ہی نہ تھی، مصیبت یہ ہوئی کہ ہمارے علوم وفنون کی نشر واشاعت زیادہ تر عہدِ عباسیہ میں ہوئی۔ اس زمانے میں مرکزِ اسلام پر یکسر عجمیت غالب آچکی تھی، اور مشاہیر پرستی عجمیوں کی فطرت میں داخل تھی۔ اس لئے اگر ایک طرف بادشاہ ظلِ اللہ قرار دیا گیا تو دوسری طرف ائمہ مذہب کی پرستش بھی کسی کم درجہ میں نہیں کرائی گئی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ تنقید کی حد سے بالا صرف وہ چیزیں ہو سکتی ہیں جن پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلّف ہیں۔ قرآن، بزرگانِ دین پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیتا اس لئے ان کو تنقید سے بالا کیوں سمجھا جاتے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جس قسم کی غلط عقیدت وارادت ہمارے دلوں میں بزرگانِ سلف سے پیدا ہو چکی ہے اور جو صدیوں سے متوارث چلی آتی ہے اس کو صحیح اور جائز عزت اور احترام سے بدل دینا آسان نہیں۔ ذہنی غلامی کے جوطوق وسلاسل مسلمانوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں اور جن کے وہ اب اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ گویا

Marfat.com

ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکے ہیں۔ ان کا اتار پھینکنا محال معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب کسی تیتر کو ایک عرصہ تک پنجرہ میں بند رکھا جاتے تو وہ اس قفس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اس کا مالک اُسے پنجرہ کے باہر کھلا چھوڑ دیتا ہے، خود پنجرہ لے کر آگے آگے چلتا ہے اور وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے اور چونچیں مار مار کر اس کا دروازہ کھولتا ہے۔ حالانکہ اس کے بازوؤں میں قوت بھی ہوتی ہے اور آزادی کی فضائے بسیط اس کی آنکھوں کے سامنے لیکن اس کے نزدیک جو آرام قفس کے گوشے میں ہوتا ہے کھلی فضا میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کھلی فضا کو غیر فطری چیز سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح مدت ہائے دراز کی ذہنی غلامی سے ہم اس درجہ خوگرِ بند و سلاسل ہو چکے ہیں کہ انکے اتارنے سے ایسا محسوس ہوتا ہو کہ گویا ایک متاعِ گراں بہا چھینی جا رہی ہے۔ دین ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، عاقبت خراب ہو رہی ہے۔ لیکن یہ سب ہمارے قلوب کے وساوس ہیں، ذہن کے چھلاوے ہیں، جس چیز کو ہم حقیقت سمجھ رہے ہیں وہ حقیقت نہیں۔ جو ہمیں ہدایت نظر آتی ہو وہ ہدایت نہیں دھوکہ ہے، فریب ہے اور یہ اس لئے کہ:۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا
فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَيَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۳۶-۳۷)

جو شخص خدا کے ذکر (قرآن) سے اندھا بن جاتا ہے ہم اس پر

Marfat.com

> ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ (شیاطین) ان کو راہ سے گمراہ کر دیتے ہیں۔ روکتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیدھے راستے پر ہیں۔

میں آخر الذکر "حضرات علماء کرام" کی خدمت میں باادب گزارش کروں گا کہ وہ تصریحاتِ بالا پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور دیکھیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ہمیں کدھر بلا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ان حضرات کو شکایت

آخری گزارش

ہے کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ دین سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے یہ حقیقت ہے لیکن ان حضرات نے کبھی اس امر پر غور فرمایا ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ چونکہ یہ حضرات عملی دنیا سے بالعموم الگ رہتے ہیں اس لئے انھیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ الحاد و بے دینی کی اس رَو کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ حضرات ان برائیوں کا صرف اسی قدر علاج کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے مواعظ و فتاویٰ میں ان لوگوں کو مردود و ملعون قرار دے دیا جائے۔ لیکن اس سے اصلاح تو نہیں ہو سکتی۔ اس سے تو مرض اور بڑھ جاتا ہے مجھے نوجوانوں کی ایسی جماعت سے خلا ملا کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ درحقیقت میری زندگی ہی ان میں گزری ہے۔ اس لئے میں نے ان کی ذہنی رفتار اور رجحاناتِ قلبی کا گہرا مطالعہ کیا ہے میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے بہتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کی فطرتِ صحیحہ نے

Marfat.com

مذہبیات کے اس حصّہ سے بغاوت کرنی چاہی جو انسانوں کا وضع کردہ ہے لیکن ان پر جبر کیا گیا کہ وہ اسے بھی دینِ خداوندی سمجھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس حصّہ سے بھی بغاوت کرنے لگے جو فی الواقع خدا کی طرف سے تھا۔ چنانچہ مجھے کئی ایک ایسے نوجوانوں سے سابقہ پڑا جو اسی طرح ہمارے "حامیانِ دین" کے بگاڑے ہوتے مریض تھے۔ میں نے ان "علما گزیدہ" نوجوانوں کے سامنے آہستہ آہستہ وہ دین پیش کیا جو فی الحقیقت دِین ہے، تو میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت کے گرویدہ ہو گئے۔ چنانچہ آج ان میں سے اکثر اپنی بیشتر مساعی دین کی مدافعت میں صرف کر رہے ہیں۔ میں نے ایسا کرنے میں قطعاً یہ نہیں کیا کہ ان کی خاطر دین میں مُداہنت برتی ہو، ان کے ذہنی وقلبی رُجحانات کی رعایت سے حقیقت کو اُن سے چھپایا ہو۔ میں نے صرف یہ کیا کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن سے اور اس کی عملی مثال اسوۂ رسول اللہؐ سے جو خود قرآن کے اندر موجود ہے، ان کے سامنے رکھ دی اور اس کے بعد بتا دیا کہ کوئی نظریہ یا قول خواہ زمانہ جدید سے متعلق ہو یا قدیم سے، جو اس کسوٹی پر پورا نہ اُترے وہ کبھی حقیقت ثابتہ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت صرف یہی ہے اور یہی دین ہے۔ چنانچہ اسکے نتائج بڑے اطمینان بخش ظاہر ہوتے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور ایسے ماحول کا تجربہ ہے جسے یکسر "یورپ زدہ" ماحول کہنا چاہئے۔ اور جس کے

Marfat.com

ہاتھوں مولوی صاحبان اس درجہ نالاں ہیں۔ اور یہی تجربہ ہے جو اِن سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔ یہ وہ بصیرت ہے جو مجھے قرآن سے حاصل ہوئی ہیں اپنے فہم قرآن کو کبھی سہو و خطا سے مبرّیٰ نہیں سمجھتا۔ میں اپنی ہر غلطی کی اصلاح کے لئے ہر وقت تیار ہوں بشرطیکہ وہ غلطی قرآن ہی سے ثابت کی جائے۔ ان الھدیٰ ھدی اللہ وفیھا بصائر للناس وھدی ورحمۃ لقوم یوقنون۔

Marfat.com

استدراک

(سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

"شخصیت پرستی" کا مضمون سب سے پہلے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ اس پر مدیر رسالہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک استدراک لکھا تھا۔ اس استدراک کا وہ حصہ جو حدیث کی تنقید سے متعلق ہے، درج ذیل کیا جاتا ہے۔

یہ تو اس گروہ کا حال تھا جو احادیث کی اصولی ظنیت کی بناء پر انھیں بالکلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجئے جو دوسری انتہا کی طرف گیا ہے یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابلِ اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابلِ اعتبار، اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور صحت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد

Marfat.com

کو چھوڑ دیں، جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں، ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں، رواۃ کے عدل وضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آرا کا وہ اظہار کر گئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں، ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں، مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یکسر تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی مخالفت جناب پرویز کرنا چاہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی مخالفت بالکل جائز ہی۔ ا/سلو

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم، یہ بھی مسلّم کہ نقد حدیث کے لئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہر حال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جسے وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو

Marfat.com

بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظنِ غالب ہے مزید برآں یہ ظنِ غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظِ روایت تھا نہ کہ بلحاظِ درایت ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا، اس لئے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑیگا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہیں ان میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد، دوسرے بلحاظ تفقہ۔

اس مطلب کی توضیح کے لئے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کو جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلہ میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے وہ جھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کرکے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلاشبہ

Marfat.com

نہایت بیش قیمت ہے مگر اس میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ اوّل تو سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل، دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرّا نہ تھے نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بُری رائے قائم کرنے میں ان کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جاتے یہ امکان محض امکانِ عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے۔ حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم نہیں، تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ عطا اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں بھی ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابو حنیفہ کے استاد اور النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھئے اپنے زمانے کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں:۔ ما رأیت انقض لعری الاسلام[1] من اهل مکة حالانکہ اس وقت مکہ مکرمہ جلیل القدر علماء و صلحا سے خالی نہ تھا شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجہ کے لوگ ہیں مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں شعبی کہتے ہیں کہ ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح کو لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ" وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے حالانکہ مسروق

---

[1] میں نے اسلام کی رسی (حلقہ) کو توڑنے والے۔ مکہ والوں سے زیادہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔

Marfat.com

سے وہ بلا تک نہیں"۔ ضحاک کو دیکھئے ایک مرتبہ اپنی بات کی بیچ میں آکر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں"۔ سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک ایسے مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں۔ اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ لا تکذب علیّ[1] کما کذب عکرمہ علی ابن عباسؓ امام مالک کی جلالت شان دیکھئے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھئے کہ ذالک[2] دجال الدجاجلہ اس سے بڑھ کر عجیب یہ کہ وہ تمام علماء عراق پر سخت طعن کرتے ہیں اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ انزلوھم[3] منزلۃ اھل الکتاب لا تصدقوھم ولا تکذبوھم امام ابوحنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں۔ اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی نہ رمضان کا روزہ رکھا، نہ غسل جنابت کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش الماء من الماء کے قائل تھے اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق سحری کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر بھی فلانے نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ" میں اس عالم کو نہیں سمجھتا"

---

[1] میری طرف جھوٹ منسوب نہ کرنا جیسے عکرمہ نے ابن عباسؓ کی طرف جھوٹ منسوب کیا۔

[2] وہ دجالوں کا سردار ہے۔ [3] علماء عراق کو (اہل کتاب) اور یہودیوں کی طرح سمجھو۔ ان کی بات کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔

Marfat.com

"یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری اوزاعی، ابوعثمان النہدی، طاؤس غرض اس عہد کے متعدد بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں، حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انھوں نے کہا کہ لیس بثقة[1] ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمر نے سُنا کہ ابوہریرہؓ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے تھے فرمانے لگے کہ ابوہریرہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر انسؓ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانیں۔ وہ تو اس زمانے میں بچے تھے۔ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ وشاھدٍ و مشھودٍ کے معنی پوچھے گئے انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن الزبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیدیا۔ عبادہ بن الصامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا، حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہو کہ اسماء الرجال

---

[1] بے اعتبار آدمی ہے۔

Marfat.com

کا سارا علم غلط ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے، بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو، اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ ٹھیرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور نیک نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو مشکل ہے اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے روایت کے بیان میں ان تمام جزئیات کو ملحوظ بھی رکھا ہے، جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ فن رجال کا حال ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز مسئلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے، آیا وہ اس کا ہم عصر تھا یا نہیں، ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں، اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سُنی یا کسی اور سے سن لی، اور اس کا حوالہ نہیں دیا، ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے۔ مگر لازم نہیں کہ ہر ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان

Marfat.com

کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا معضل یا منقطع ہیں، اور اس بنا پر پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ایسے ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سُنّت نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، محدّثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنی تھی اس لئے ان پر اخباری نقطۂ نظر غالب ہو گیا تھا، اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں۔ رہا فقیہانہ نقطۂ نظر تو ان کے موضوعِ خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لئے اکثر وہ انکی نگاہوں

Marfat.com

سے اوجھل ہوجاتا تھا اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ معناً وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے۔ مگر جو لوگ علوم شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر بکثرت مواقع پر فقیہانہ نقطۂ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن اور اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے جو فقہاء مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ جس طرح حدیث کو بالکلیہ رد کر دینے والے غلطی پر ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جنھوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے، اور وہی مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک

Marfat.com

ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالک کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے، مگر پھر بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتوے دینے پر مجبور کیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ستر مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

Marfat.com

علمِ حدیث

(علامہ حافظ اسلم جیراجپوری صاحب مدظلہ)

مذہب کی اصطلاح میں بدعت اس کام کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلعم نے نہ کیا ہو، اور زمانہ ما بعد میں سے ایک نئی چیز کی حیثیت سے اختیار کر لیا جائے۔ بدعت کے متعلق مذہب والوں کا فیصلہ ہے کہ کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے۔

حدیث کی دو کتابوں کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ایک بخاری دوسری مسلم۔ مسلم میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے کچھ لکھ لیا ہو تو اس کو مٹا دے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کا کوئی مجموعہ لکھوا کر امت کو نہیں دیا اور جہاں تک دوسرے لکھنے والوں کا تعلق تھا ان کے لئے مسلم کی مندرجہ بالا حدیث کے مطابق تاکیدی حکم فرما دیا کہ کوئی شخص قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین نے بھی حدیثوں کا کوئی مجموعہ امت کو نہ دیا۔

اب ظاہر ہے کہ جس بات کو نہ رسول اللہؐ نے کیا نہ خلفائے راشدین نے، بلکہ اس کے کرنے سے رسول اللہؐ نے تاکیداً منع فرما دیا، اگر اس کام

Marfat.com

کو بعد میں کیا جائے گا تو یہ نہ صرف بدعت ہوگا بلکہ معصیت رسولؐ۔

اور یہ واقعہ ہے کہ بعد کے زمانے میں ان حدیثوں کو لکھا گیا اور ان کے یہ لکھے ہوئے مجموعے ہمارے پاس اس وقت تک موجود ہیں۔

کہئے کہ خود اہلِ مذہب کی اصطلاح کے مطابق یہ چیز بدعت ہے یا نہیں۔ وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ ایک بدعت حسنہ ہوتی ہے، یعنی کسی اچھی بات کا اختیار کرنا۔ سوال یہ ہے کہ جس کام سے رسول اللہؐ نے یوں تاکیداً روک دیا ہو اُسے بدعت حسنہ کہنا کس طرح سے جائز ہوگا؟ یہ تو رسول اللہ صلعم کے حکم کی صریح مخالفت ہے۔

۲- قرآن انجیل کو محرف قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ العلم نہیں ہے کیونکہ العلم کے لئے یقینی ہونا ضروری ہے۔ اناجیل کیا ہیں؟ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی باتیں جو ان کے "صحابہ" (حواریین) نے ان کی وفات کے بعد لکھیں، اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلعم کی باتیں (عربی میں بات کو حدیث کہتے ہیں) جامعین حدیث نے لکھیں، بلکہ اناجیل تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بعد قریب قریب پہلی صدی ہی میں مرتّب ہو گئی تھیں اور ہماری کتب احادیث میں پہلا (مختصر سا مجموعہ) موطا ہے جو دوسری صدی میں مرتّب ہوا اور صحیحین (بلکہ بقایا صحاح ستہ) تیسری صدی میں۔ امام بخاریؒ نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔

قرآن اناجیل کو ناقابلِ اعتماد قرار دیتا ہے اور ہم ان کے محرف ہونے پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اسی طریق سے جو روایات کے مجموعے ہمارے ہاں مرتّب ہوتے ہیں ان کے متعلق امت سے کہا جاتا ہے کہ انہیں قرآن

Marfat.com

کی مثل یقینی ماننا ہوگا، اس قرآن کی مثل جس کے متعلق خود خدا نے ایک بار نہیں متعدد بار یہ فرمایا کہ اس کی مثل ناممکن ہے۔

۳ - یہودیوں کے ہاں ایک تو تورات ہے اور اس کے علاوہ تالمود جو ان کے انبیاء کی روایات کا مجموعہ ہے۔ وہ تالمود کو تورات کی مثل قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے انھوں نے یہ عقیدہ قائم کر رکھا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک تورہ شبکتب یعنی وحی مکتوب اور دوسری تورہ شبعلفہ یعنی وحی غیر مکتوب۔ اس لئے ان کا عقیدہ ہے کہ روایات جو وحی غیر مکتوب ہیں تورات کی ہم پایہ ہیں۔ قرآن نے بار بار اس کی تصریح کی ہے کہ رسول اللہؐ پر جو وحی نازل ہوئی وہ سب قرآن میں ہے، قرآن کے باہر کہیں نہیں۔ اس لئے قرآن کی رو سے رسولؐ کی وحی کی ایک ہی قسم ہے لیکن جب بعد میں روایات کو دین بنایا گیا تو ان کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ یہ قرآن کی مثل ہیں اور اس عقیدہ کی بنیاد یہودیوں کے اسی تصور پر رکھی گئی جس کی رو سے انھوں نے وحی کی دو قسمیں کی تھیں۔ چنانچہ اب ہمارے ہاں بھی یہ مانا جاتا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک وحی جلی اور دوسری وحی خفی۔ یا ایک وحی متلو (جس کی تلاوت کی جاتی ہے ـــ قرآن) اور دوسری وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہیں کی جاتی ـــ احادیث) وحی کی اس تقسیم یا ان اصطلاحات کا نہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں کوئی پتہ ملتا ہے نہ صحابہ کے دور میں۔

۴ - اس کے بعد عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگا کہ جب دین

Marfat.com

کی رو سے حقیقت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے قرآن ہی نازل ہوا۔ یہی رسول اللہؐ کی وحی تھی، اسی کی حفاظت کا خدا نے ذمہ لیا، اسی کو رسول اللہؐ نے لکھوا کر، حفظ یاد کرا کر محفوظ طور پر اُمت کو دیا۔ اسی کی خلفائے راشدین نے اشاعت کی، تو پھر احادیث کو دین کیسے بنا دیا گیا؟ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ، نے اپنے اس مضمون میں علم حدیث کے متعلق اپنے مخصوص محققانہ انداز میں بحث کی ہے۔ آپ نے اپنے مضمون میں بعض مقامات پر عمل متواتر کا بھی ذکر کیا تھا لیکن چونکہ وہ ایک الگ موضوع ہے اور اس کا ان روایات سے تعلق نہیں جو احادیث کے مجموعوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں، اس لئے ہم نے ان حصوں کو مضمون سے حذف کر دیا ہے۔

حدیثیں یعنی وہ اقوال و اعمال و احوال وغیرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور بسلسلۂ روایت کتابوں میں مدوّن کئے گئے ہیں، ان کے متعلق ابتدا ہی میں یہ بحث شروع ہوئی کہ ان کی حیثیت دینی نہیں ہے بلکہ تاریخی ہے جس کی بنا اس پر تھی کہ ان کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غیر یقینی ہے۔ کیونکہ خبروں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صبح سے شام تک میں تبدیل ہو کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں اور جتنے بڑے آدمی کی باتیں بیان کی جاتی ہیں، اتنا ہی ان میں تبدل و تغیر کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سے بڑے آدمی تھے۔ چنانچہ پہلی ہی صدی ہجری سے اُمت میں ایسے طبقات پیدا

Marfat.com

ہو گئے جو اپنے اغراض کے لئے حدیثیں بنا کر حضورؐ کی طرف منسوب کرنے لگے۔ وضاعین وکذابین کے تراجم اور موضوع روایات جن کے بیسیوں مجموعے موجود ہیں، اس پر شاہد ہیں اور آج حدیث کی جس قدر کتابیں امت کے ہاتھوں میں ہیں، اس پر شاہد ہیں کہ ...... ان میں سے کوئی عہدِ رسالت یا زمانۂ صحابہ کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک مؤطا امام مالکؒ کے سوا جو دوسری صدی ہجری کی تالیف ہے، بقیہ جملہ کتبِ حدیث جن میں صحاح ستہ بھی شامل ہیں، تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کی مرتب کی ہوئی ہیں۔

محدثین نے روایات کو دینی تسلیم کر لیا اور ان کے اثر سے تمام اُمت میں ان کی دینی حیثیت مسلّم ہو گئی، مگر محققین کی ایک جماعت ہمیشہ سے قرآن ہی کو مکمل دین مانتی اور حدیثوں کو تاریخ دینی سمجھتی رہی ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ تاریخ حدیث کے ان ابواب کو روشنی میں لاؤں جن سے اس کی حقیقت واضح ہوتی ہے تاکہ اس کا صحیح رتبہ معلوم ہو سکے۔

روایت حدیث

روایت کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں ہو چکا تھا صحابہ کرامؓ جن اوقات میں صحبتِ مبارک میں موجود نہیں رہتے تھے، ان اوقات کے احوال و اقوال نبویؐ کو دوسرے صحابہ سے جو حاضر رہتے تھے، پوچھتے اور سنتے تھے۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ میں اور میرے ایک انصاری پڑوسی[1] باری باری سے ایک ایک دن رسالتمآبؐ

---

[1] ان کی سکونت مسجد نبوی سے فاصلہ پر محلہ بنی امیہ بن زید میں تھی۔

Marfat.com

کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، پھر ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے دن کے وہ حالات جو وہاں گذرتے تھے، سُنا دیتے تھے[1] لیکن یہ حضرات کرام سنتے اسی سے تھے جس پر ان کو خود اعتماد ہوتا تھا، کیونکہ اس عہد میں منافقین بھی تھے جو طرح طرح کی غلط باتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کیا کرتے تھے اور وہ مسلمانوں میں ملے جُلے رہتے تھے کہ ان کا امتیاز کرنا مشکل تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:-

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ۔ (۹/۱۰۱)

مدینہ والوں میں سے کچھ لوگ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ تم ان کو جانتے نہیں ہو، ہم ان کو جانتے ہیں۔

علاوہ بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے بچو[2]۔ اس لئے عہدِ رسالت میں روایتیں بہت تھوڑی تھیں اور وہ بھی اخباری حیثیت رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ چونکہ اپنی محبوب ترین شخصیت سے محروم ہو گئے تھے، اس لئے فرصت کے اوقات میں دو چار جب مل کر بیٹھتے تو آپؐ کے زمانے کے تذکرے درمیان میں لاکر آپ کی یاد تازہ کرتے مگر ان بیانات میں اختلاف ہونے لگے، اس وجہ سے

---

[1] صحیح بخاری۔ [2] ابن ماجہ ص ۵۔

Marfat.com

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ نے روایت کی یک قلم ممانعت کر دی اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:

تم جب آج اختلافات کرتے ہو تو آئندہ نسلیں اور بھی اختلافات کریں گی۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے، جو اس نے جائز کیا ہے اس کو جائز اور جو اس نے ناجائز کیا ہے اس کو ناجائز سمجھو۔[1]

مگر باوجود اس ممانعت کے بھی روایت کا سلسلہ جاری رہا، کیونکہ اس کو جرم نہیں قرار دیا گیا تھا۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ بھی اپنے زمانے میں روایت کو روکتے رہے۔ قرظہ بن کعبؓ کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت کے ساتھ عراق کو روانہ ہوئے حضرت عمرؓ مقام صرار تک ہم کو رخصت کرنے کے لئے ساتھ آئے، وہاں پہنچ کر فرمایا: "تم جانتے ہو کہ میں کیوں یہاں آیا ہوں؟" ہم نے کہا کہ ہماری مشایعت اور تکریم کی غرض سے۔ فرمایا کہ ہاں! اور اس لئے بھی کہ تم سے کہوں کہ تم وہاں جا رہے ہو، جہاں لوگوں کی تلاوتِ قرآن کی آواز شہد کی مکھیوں کی آواز کی طرح گونجتی رہتی ہے، لہٰذا ان کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا اور روایتیں نہ سنانا" قرظہ کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے پھر کبھی میں نے حدیث نہیں بیان کی۔[2]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ذہبی [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۷۵

فاروق اعظمؓ روایت کے معاملے میں اس قدر سخت تھے کہ ابی بن کعب کو جب حدیثیں سناتے دیکھا تو دُرّہ لے کر ان کو مارنے کے لئے تیار ہو گئے[1]۔ ایک بار ابوسلمہؓ نے حضرت ابوہریرہؓ سے جو کثرتِ روایت میں مشہور ہیں، پوچھا کہ کیا تم اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انھوں نے کہا گر ان کے زمانہ میں بیان کرتا تو مجھے پیٹ ڈالتے[2]۔

حضرت عمرؓ اس امر میں صحابہ کبار کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابوالدرداءؓ اور ابوذر رضی اللہ عنہم کو ڈانٹا کہ تم یہ کیا روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے رہتے ہو؟ پھر ان کو مدینہ میں نظر بند رکھا اور جب تک زندہ رہے کہیں جانے کی اجازت نہیں دی۔

خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کو روایت کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور وہ اس کو مسترد کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت علیؓ کے بیٹے محمد اپنے والد سے ایک پرچہ لے کر جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم زکوٰۃ کے متعلق لکھا ہوا تھا، ان کے پاس گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے معاف رکھو[3]۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کثرتِ روایت سے منع فرماتے۔ خود ان کے سامنے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۷

[2]، [3] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری ص ۱۱ تا ۱۸۔

Marfat.com

جب کوئی حدیث بیان کرتا تو اس سے حلف لیتے[۱]۔ اکثر تاکید کیا کرتے کہ جن حدیثوں کو لوگ نہیں جانتے ان کو نہ بیان کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ اللہ و رسولؐ کی تکذیب کرنے لگیں[۲]؟

خلفائے راشدین ہی کی طرح بالعموم صحابہ کرامؓ بھی روایت کے معاملہ میں سخت محتاط تھے بلکہ بعض حضرات اس سے بالکلیہ اجتناب کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت زبیرؓ سے ان کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ جس طرح دوسرے اصحاب حدیثیں بیان کرتے ہیں، میں نے آپ کو بیان کرتے نہیں سنا۔ فرمایا کہ میں نے کبھی آنحضرتؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں نے آپ کو یہ کہتے سنا ہے کہ من کذب علی فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔ پھر حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں نے اس میں "متعمدا" یعنی قصدًا کا لفظ بڑھا لیا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے یہ لفظ رسول اللہؐ کی زبان سے نہیں سنا[۳]۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ توسیع روایت کے لئے لوگوں نے کر لیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی بات منسوب کرنا خواہ قصدًا ہو یا بلا قصد جہنم مول لینا ہے۔ حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فرمان مجھکو حدیث بیان کرنے سے روکتا ہے[۴]۔

---

[۱] تا [۵] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری ص ۱۱ تا ۱۰

Marfat.com

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے حضرت زید بن ارقمؓ سے درخواست کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنائیے۔ فرمایا کہ ہم بوڑھے ہوگئے اور بھول گئے اور آنحضرتؐ کی حدیث بیان کرنے کا معاملہ بھی بہت سخت ہے۔ سائب بن یزید کا بیان ہے کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ تک گیا، مگر ان کو کوئی حدیث بیان کرتے نہیں سُنا۔ اسی طرح امام شعبی کا قول ہے کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک سال تک رہا اور کوئی حدیث ان کی زبان سے نہیں سنی[۱]۔ یہی نہیں کہ صحابہ خود حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے بلکہ دوسروں سے جو حدیثیں سنتے تھے، ان کو قبول کرنے میں بھی تامل فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر صحابہ سے بہت سی روایتوں کے قبول کرنے میں توقف کرنا ثابت ہے جس سے ان لوگوں نے سند پکڑی ہے جو حدیثوں کو دینی حجت نہیں مانتے[۲]۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو کہ آگ کی چھوئی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ اس بنیاد پر تو آگ پر گرم کئے ہوئے پانی سے وضو ہی نہیں ہوسکتا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کھیتی کے کتے کے متعلق سُنی تو فرمایا کہ ہاں ابوہریرہؓ کے پاس کھیتی ہے[۳]۔

حضرت محمود انصاری نے جو صحابی تھے جب یہ حدیث بیان کی کہ

---

[۱] تا [۳] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری ص ۱۱ تا ۱۸

جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہہ دیا وہ جہنم کے اوپر حرام ہو گیا تو حضرت ابو ایوب انصاری نے فرمایا کہ واللہ! میں نہیں سمجھتا کہ رسول اللہؐ نے کبھی بھی ایسا کہا ہو۔[1]

بعض روایات کو صحابہ نے قرآن کے خلاف دیکھ کر ان کے قبول کرنے سے انکار کر دیا مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاقِ بائنہ پائی ہوئی عورت کے لئے شوہر کے ذمے نہ مکان ہے نہ نفقہ، حضرت عمرؓ نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ قرآن کے خلاف ایک عورت کی بات کیسے مان لوں جس نے معلوم نہیں کہ صحیح یاد بھی رکھا ہے یا نہیں؟

حضرت ابن عمرؓ نے قلیبِ بدر والی روایت جب بیان کی کہ مُردے سُنتے ہیں تو اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ ابنِ عمرؓ پر رحم کرے۔ قرآن میں تو ہے: "انک لا تسمع الموتٰی وما انت بمسمع من فی القبور"

اسی طرح جب اُمّ المؤمنینؓ موصوفہ کے سامنے یہ روایت پیش کی گئی کہ مُردہ پر اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو کہا یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اُٹھائے گا۔ لا تزر وازرۃ وزر اخرٰی۔

اس قسم کی روایات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صحابہ حدیث کو حتمی حجّت

---

[1] صحیح بخاری باب صلوٰۃ النوافل جماعتہً۔

Marfat.com

نہیں سمجھتے تھے اور کبھی قرآن اور کبھی قیاس کے خلاف دیکھ کر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

وجوہاتِ مذکورہ کے باعث عہدِ صحابہ میں روایات کا ذخیرہ نہایت قلیل تھا۔ علاوہ بریں وہ عملی زندگی میں منہمک تھے اور اعلائے کلمۃ الحق و حروب و فتوحات کی مشغولیت سے ان کے لئے یہ موقع بھی کم تھا کہ بیٹھ کر روایتیں کرتے، اس لئے یہ بالکل قریبِ قیاس ہے کہ ان ناموں سے جو بیشمار روایتیں منسوب کی گئی ہیں وہ زمانۂ مابعد کے رواۃ کا کارنامہ ہیں، جبکہ حدیثوں نے فن کی صورت اختیار کر لی اور ہر روایت کے لئے سلسلۂ سند کی ضرورت پڑی جو بلا کسی صحابی کے آنحضرت صلعم تک منتہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جماعتِ صحابہ میں سب سے زیادہ جس کے نام سے روایتیں بیان کی گئی ہیں، وہ حضرت ابوہریرہؓ ہیں۔ ابن مخلّد کا بیان ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے[1]۔ حالانکہ وہ عام خیبر میں اسلام لائے اور صرف تین سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضوری میں شرف یابی کا موقع پایا۔ پھر یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ ان کی روایتیں اس قدر ہو سکتی ہیں جن میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ ان کے اوپر عقل و علم کی رُو سے گرفت کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہمارا ضمیر قبول نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی روایتیں

فتح خیبر ۷ھ اسلام لایا

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۱۔

Marfat.com

انھوں نے بیان کی ہوں گی۔

عہدِ صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ آتا ہے جس میں خلفائے بنی اُمیہ کا استبداد اُمت پر مسلط ہو چکا تھا اور بجائے اس کے کہ خلافتِ راشدہ میں ہر مسلم خود مختار، آزاد اور صرف اکیلے اللہ کا بندہ ہوتا، اب شخصی حکومت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا اور تمام اُمت جبرًا و قہرًا رعایا بنائی گئی تھی، اس لئے ذہنیتوں میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی اور صلاح و تقویٰ کی بھی وہ کیفیت باقی نہیں تھی جو صحابۂ کرام کے عہد میں تھی۔ سلطنت اور مذہب میں تفریق ہو جانے کے باعث دینی قیادت علماء کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اس وجہ سے روایت کا سلسلہ بہ نسبت سابق کے بڑھ گیا تھا، پھر بھی ان شاگردانِ صحابہ میں بہت کچھ صداقت موجود تھی اور وہ روایتوں کے بیان نیز ان کے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جب حدیث کی تدوین شروع ہوئی، اس نے فن کی صورت اختیار کر لی اور طالبانِ حدیث ان ائمہ کے پاس جو اس میں شہرت رکھتے تھے، اس کی تحصیل کے لئے جمع ہونے لگے اور یہ سلسلہ بڑھنے لگا۔ عہدِ عباسیہ میں جو ۱۳۲ھ ہجری سے شروع ہوا، حدیثوں کی روایت سیلاب کی طرح بڑھ گئی اور جملہ اسلامی ممالک میں کثرت کے ساتھ اس کا چرچا پھیل گیا، کیونکہ خلفاء و اُمراء کی دنیا داری اور دین سے بے پروائی کی وجہ سے طالبانِ دین تمام تر علمائے حدیث کے گرد سمٹ گئے، جس سے ان کی عظمت و شان

Marfat.com

قائم ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ہزاروں دنیاوی جاہ وشہرت کے طالبوں نے بھی حدیث کا پیشہ اختیار کرلیا اور سچی اور جھوٹی ہر قسم کی روایتیں بیان کر کے عوام پر اپنی بزرگی کا سکہ جمانے لگے، یہاں تک کہ حدیثوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے اوپر ہے[1]۔ امام یحییٰ بن معینؒ جو حدیث کے امیرالمؤمنین بولے جاتے ہیں، بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے[2]۔ مقدمہ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاریؒ نے جب اپنی صحیح لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں، ۲۷۵۰ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق پایا جن کو درج کیا۔

لیکن خود انھیں ائمہ حدیث میں سے جن کا مشغلہ دن رات روایت تھا، ایسے لوگ نکلے جن کی طبیعتیں اس سے بیزار ہوگئیں اور وہ اسکو تقویٰ کے خلاف سمجھنے لگے۔ حافظ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ کی کتاب مختصر جامع بیان العلم وفضلہ سے اقتباس کر کے چند ائمہ کے اقوال لکھتا ہوں:

صحاک ابن مزاحم متوفی ۱۰۵ھ نے فرمایا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ قرآن لٹکا دیا جائیگا، اس کے اوپر مکڑیاں جالے تنیں گی۔ کوئی کام اس سے نہیں لیا جائے گا اور لوگوں کا عمل حدیث وروایت پر ہوگا۔ سلیمان بن حیان ازدی متوفی ۱۹۶ھ نے بھی جن کی کنیت ابوخالد الاحمر ہے کہا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مصاحف کو بیکار چھوڑ دیں گے اور صرف حدیث وفقہ ان کا مشغلہ ہوگا۔

---

[1] توجیہ النظر ص [2] تہذیب الاسماء واللغات جلد۱ ص ۱۵۷

Marfat.com

امام داؤد طائی نے روایت ترک کر دی تھی ، ان سے کہا گیا کہ کب تک آپ حدیث کی تعلیم چھوڑ کر گھر میں بیٹھے رہیں گے۔ جواب دیا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ ایسے راستے میں ایک قدم بھی رکھوں جو حق کے خلاف ہو۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ عابد الحرمین متوفی ۱۸۷ھ کے پاس ایک جماعت طالبانِ حدیث کی پہنچی۔ انھوں نے ان کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی اور کھڑکی سے ان کی طرف سر نکالا۔ لوگوں نے سلام کیا اور کیفیت پوچھی۔ فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے تو عافیت میں ہوں مگر تمہاری طرف سے مصیبت میں جس شغل میں تم ہو، یہ اسلام میں نئی بدعت پیدا ہوئی ہے" انا للہ وانا الیہ راجعون"، تم نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس کو حاصل کرتے تو تمہارے دلوں کو شفا نصیب ہوتی۔ لوگوں نے کہا کہ اسے تو ہم پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا کہ وہ ایسی کتاب ہے جو تمہاری، تمہاری اولاد کی مشغولیت کیلئے بھی کافی ہے پھر یہ آیت پڑھی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ - قُلْ بِفَضْلِ اللهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ.

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت آچکی۔ کہہ دے کہ اللہ کی مہربانی اور اس کی رحمت پر تم خوشی مناؤ، یہ اس سے بہتر ہے جس کو تم جمع کر رہے ہو۔

امام سفیان ثوریؒ متوفی ۱۶۱ھ افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے

Marfat.com

کہ اس علم میں کیا خوبی ہے جس میں ساٹھ سال گذارنے کے بعد اب یہی آرزو ہے کہ کاش برابر سرابر نکل جاتے، نہ عذاب پاتے، نہ ثواب۔ ایک بار فرمایا کہ حدیث اگر اچھی چیز ہوتی تو روز بروز بڑھتی نہ جاتی۔

امام شعبہؒ نے کہا کہ پہلے جب میں کسی محدث کو دیکھتا تھا تو خوش ہوتا تھا مگر اب کوئی شے میرے نزدیک اس سے زیادہ مکروہ نہیں ہے کہ میں ان میں سے کسی کا چہرہ دیکھوں۔ ایک بار انھوں نے راویانِ حدیث کی ایک جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا:

إِنَّ هٰذَا الْحَدِيْثَ يَصُدُّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ[1]

امام سفیان بن عیینہؒ متوفی ۱۹۸ھ کہا کرتے تھے کہ کاش یہ علم (حدیث) میرے سر پر شیشیوں کا ٹوکرا ہوتا اور گر کر چور چور ہو جاتا کہ اس کے خریداروں سے تو نجات مل جاتی۔ ایک بار فرمایا: کہ جو مجھ سے دشمنی رکھے اللہ اس کو محدث بنا دے۔ ایک دن اصحابِ حدیث کی ایک جماعت سے کہا کہ اگر ہم کو اور تم کو حضرت عمرؓ دیکھ پاتے تو دُرّے سے خبر لیتے۔ امام شعبہؒ کی طرح یہ بھی محدثوں کی صورت سے بیزار تھے۔ طالبانِ حدیث کے ہجوم سے بھاگ کر اپنے گاؤں میل اخضر میں رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ حدیث اگر خیر ہوتی تو روز بروز کم ہوتی، بڑھتی نہ جاتی۔

---

[1] یہ حدیث تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے کیا تم باز آجاؤ گے؟ اس میں لطف یہ ہے کہ ان ھذا الحدیث کو چھوڑ کر بقیہ جملہ قرآن کی آیت ہے۔

Marfat.com

اس عہد کے مشہور شاعر بکر بن حماد نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے وہ کہتا ہے:

لقد[1] جفت الاقلام بالخلق کلہم — فمنہم شقی خائب و سعید

تمر[2] اللیالی بالنفوس سریعۃ — ویبدیٔ ربی خلقہ و یعید

اری[3] الخیر فی الدنیا یقل کثیرہ — و ینقص نقصا والحدیث یزید

فلو[4] کان خیراً قل کالخیر کلہ — و احسب ان الخیر منہ بعید

[1] یعنی ساری مخلوقات کی تقدیر لکھ کر قلم خشک ہو چکا۔ اب کوئی ان میں سے بدبخت نامراد ہے کوئی بدنصیب۔

[2] زمانہ لوگوں پر تیزی سے گذر رہا ہے اور اللہ مخلوق کو یکے بعد دیگرے پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

[3] میں دیکھتا ہوں کہ اچھی چیزیں دنیا میں کم ہوتی اور گھٹتی جا رہی ہیں لیکن حدیث ہے کہ برابر بڑھتی جاتی ہے۔

[4] اگر یہ بھی اچھی چیز ہوتی تو دوسری اچھی چیزوں کی طرح گھٹتی۔ میرا خیال ہے کہ خیر اس سے بعید ہے۔

یہ اقوال ان اہلِ بصیرت ائمہ حدیث کے ہیں جنھوں نے قرآن کریم کے کمال اور جامعیت کو دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ حدیث کی حیثیت دینی نہیں ہے، مگر عام محدثین کے نفوس و طبائع پر حدیث کا دینی حیثیت سے اس قدر غلبہ ہو چکا تھا کہ ان کا انحراف اس سے مشکل تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان اماموں کے اقوال کے اثر کو مٹانے کے لئے روایت کی فضیلت اور اس کے ثواب کی

Marfat.com

حدیثیں پھیلائیں۔ نیز ان بزرگوں کی مخالفت بلکہ اہانت کے لئے اس قسم کی روایتیں وضع کیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب ایسا ہوگا کہ تم میں سے کوئی پیٹ بھرا شخص اپنے پلنگ پر تکیہ لگائے میری حدیثیں سن کر یہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان قرآن ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔ یاد رکھو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے مثل اور بھی بلکہ زیادہ[1]" حالانکہ صدیق اکبرؓ نے جیسا کہ ہم نقل کر چکے ہیں، روایت سے منع کرتے وقت یہی فرمایا تھا کہ اگر کوئی سوال کرے تو اس سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے جو اس نے جائز کیا ہے اس کو جائز اور جو ناجائز کیا ہے اس کو ناجائز سمجھو۔ نیز فاروق اعظمؓ فرمایا کرتے تھے کہ "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ" ہمارے واسطے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اُن کے خلاف یہ روایت قرآن کریم کو ناکافی اور غیر مکمل بتاتی ہے جو اس کے جعلی ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

اسی قسم کی باہم متعارض روایات کو دیکھ کر جو ہر باب اور ہر شعبہ میں ہیں، معتزلہ نے محدثین پر سخت حملے کئے کہ تم نے مکذوب روایات سے دین کو فاسد کر ڈالا، اور علماء میں اختلاف پیدا کیا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی مخالفت بلکہ تکفیر کرنے لگے، یہاں تک کہ اُمت فرقوں میں بٹ گئی۔ امام

[1] مشکوٰۃ ص ۱۸

Marfat.com

ابن قتیبہؒ نے کتاب مختلف الحدیث لکھ کر ان اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی، لیکن اس میں سوائے محدثانہ تاویلات و توجیہات کے اور کیا ہے؟

الغرض ان ائمہ کے باعث قصرِ حدیث میں جو زلزلہ آگیا تھا، اس کا روک دینا محدثین کے لئے کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ آخر کار حدیث کا غلبہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قرآن کریم سے بھی اس کی اہمیت بڑھا دی گئی۔ امام اوزاعیؒ نے کہا کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے، جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی۔ امام یحییٰ بن کثیر کا قول ہے کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔ یہ بات جب امام احمد بن حنبلؒ سے کہی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ میں اتنی جسارت تو نہیں کر سکتا، ہاں یہ کہتا ہوں کہ حدیثیں قرآن کی مفسّر ہیں[1]۔

کتابت حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اعلان فرما دیا تھا کہ:

"مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے کچھ لکھ لیا ہو تو اس کو مٹا دے۔"

یہ روایت صحیح مسلم میں ہے۔ اس وجہ سے محدثین اس کو موضوع تو نہیں کہہ سکے، مگر چونکہ اس سے ان کی ساری بنیاد منہدم ہوتی جاتی تھی، اس لئے اس کی

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۲۳

Marfat.com

توجیہ یہ کی کہ مقصد اس ممانعت سے یہ تھا کہ قرآن مجید کے ساتھ کوئی دوسری چیز مخلوط نہ ہو جائے۔ لہٰذا جب التباس کا خوف نہ ہو تو کتابت جائز ہے۔ اس طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کتابتِ حدیث کے واضح اور صریح حکم کو مٹا دیا گیا حالانکہ آپؐ نے اس کی کوئی عِلّت بیان نہیں فرمائی تھی اور بلا کسی قید کے مطلقاً ممانعت کی تھی۔ اگر حضور اکرمؐ کا یہ مقصد ہوتا کہ قرآن و حدیث مخلوط نہ ہونے پائیں، تو فرما سکتے تھے کہ دونوں کو الگ الگ لکھو۔ اس لئے محدثین کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے بلکہ اصلی وجہ اس کی وہ ہے جو صحابہ کرام نے سمجھی، یعنی یہ کہ گذشتہ قومیں اپنے انبیاء کی روایات لکھنے کی بدولت گمراہ ہوئیں۔

انبیائے کرام اور خاص کر سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھنا عقل و علم کی رُو سے نہایت پسندیدہ اور مفید کام ہو سکتا تھا، مگر یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ایسی عظیم الشّان ہستیوں کے اقوال جمع و مدون کرنے کے بعد قومیں ان ہی کو اصل دین قرار دے لیتی ہیں اور کتابِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیتی ہیں۔ یہی راز تھا جس کی بنا پر حضورؐ نے کتابتِ روایت سے منع فرمایا تھا۔

محدثین نے جوازِ کتابت کے لئے بعض روایتوں سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ میں جو کچھ آنحضرتؐ سے

Marfat.com

سنا کرتا تھا، لکھ لیا کرتا تھا۔ نیز عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق بھی ان کا بیان ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ یمن کے ایک شخص ابو شاہ نے لکھوانے کی درخواست کی تو حضورؐ نے لکھوا دیا۔ مگر یہ چیزیں مستثنیات میں شمار ہوں گی۔ عام حکم یہی تھا کہ قرآن کے سوا کچھ نہ لکھا جائے، اور صحابہ کرامؓ نے اسی کے مطابق عمل کیا، چنانچہ ابو داؤد کتاب العلم میں ہے کہ ایک بار حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی امیر معاویہؓ کے پاس گئے۔ امیر موصوف نے ان سے ایک حدیث پوچھی۔ جب حضرت زیدؓ نے بیان کیا تو انھوں نے ایک شخص کو لکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زیدؓ نے اس کو لے کر مٹا دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ آپ کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعہ تقریباً پانچ سو حدیثوں کا لکھ رکھا تھا، ایک رات اس کے متعلق نہایت متردد اور مضطرب تھے۔ آخر صبح کے وقت اس کو لے کر آگ میں جلا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحیح مجموعہ اور کون ہو سکتا تھا مگر صدیق اکبرؓ نے اس کا رکھنا بھی تقویٰ کے منافی خیال کیا کہ شاید کوئی غلط روایت اس میں شامل ہو گئی ہو۔

عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار خواہش کی کہ سنن

Marfat.com

(اسوۂ رسولؐ) کو لکھوالیں صحابہ سے بھی مشورہ لیا۔ انھوں نے رائے دی۔ پھر وہ ایک مہینہ تک اللہ سے دعا اور استخارہ کرتے رہے بالآخر اس ارادہ سے باز رہے اور کہا کہ پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں اور ان ہی پر جھک پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا[1]۔

فاروق اعظمؓ جس طرح روایتِ حدیث کو روکنے میں سخت تھے۔ اسی طرح کتابت حدیث میں بھی۔ ان کے عہد میں جب حدیثیں زیادہ ہوگئیں تو اعلان کردیا کہ لوگ ان کے پاس لائیں پھر انھوں نے ان سب حدیثوں کو لیکر جلا دیا اور فرمایا کہ اہلِ کتاب کی مثناۃ بنانی چاہتے ہو[2]؟ (یہود نے اپنے انبیا کی روائتیں جمع کرکے اس کا نام مثناۃ رکھا ہے)

دیگر صحابہ کرام کا طرزِ عمل مختصر جامع بیان العلم ص۳۳ سے اقتباس کر کے لکھتا ہوں:

> عبداللہ بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ میں ہر اس شخص کو جس کے پاس حدیث لکھی ہوئی ہو، عہد دلاتا ہوں کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد اس کو مٹا ڈالے، کیونکہ گذشتہ اقوام اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انھوں نے اپنے علماء کی روایات کی پیروی کی اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

ابو نضرہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے پوچھا کہ جو حدیثیں ہم

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۳۔ [2] طبقات ابن سعد جزء خامس ص ۱۴۰

آپ کی زبان سے سنتے ہیں لکھ لیا کریں؟ فرمایا: کیا تم ان کو مصحف بنانا چاہتے ہو؟

حضرت زید بن ثابتؓ کو خلیفہ مروان نے بلایا وہاں انھوں نے کچھ لوگوں کو حدیثیں لکھتے ہوتے دیکھا۔ اُن سے فرمایا کہ ممکن ہے کہ روایت جس طرح تم سے بیان کی گئی ہے، اس طرح نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک نوشتہ لایا گیا جس میں حدیثیں تھیں انھوں نے اس کو جلا دیا اور کہا کہ میں اللہ کا واسطہ دلاتا ہوں کہ جس شخص کو کبھی کے پاس روایت کی کسی تحریر کی موجودگی کا علم ہو، وہ ضرور آکر مجھ کو بتادے تاکہ میں وہاں پہنچوں۔ تم سے پہلے اہلِ کتاب اسی باعث ہلاک ہو چکے ہیں کہ انھوں نے اس قسم کے نوشتوں کے پیچھے اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی کتابتِ حدیث سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گذشتہ قوموں کی ہلاکت اسی وجہ سے ہوئی ہے۔

یہی حال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تھا۔

عہدِ صحابہ کے بعد ائمہ تابعین بھی مثلاً علقمہ، مسروق، قاسم، شعبی، منصور، مغیرہ اور اعمش وغیرہ کتابتِ حدیث کو جائز نہیں سمجھتے تھے

امام اوزاعی کہا کرتے تھے کہ "حدیثوں کا علم جب تک زبانی تھا، شریف

Marfat.com

علم تھا مگر جب سے لکھا جانے لگا اس کا نور جاتا رہا اور نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔" یہی وجہ تھی کہ تابعین کبار کے عہد تک حدیثیں غیر مدون تھیں اور سوائے قرآن مجید کے اُمت کے ہاتھوں میں دوسری کتاب نہ تھی۔ بعض چیزیں محض علمی لحاظ سے لکھ لی گئی تھیں۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہدِ خلافت میں، جو صفر سنہ ۹۹ھ سے رجب سنہ ۱۰۱ھ تک تھا۔ سعید بن ابراہیم سے حدیثیں لکھوائیں اور مدینہ کے قاضی ابوبکر بن حزم کو فرمان بھیجا کہ عمرہ کی روایتیں لکھ لی جائیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ ان کی وفات سے ان کا علم ضائع ہو جائیگا۔ یہ عمرہ حضرت عائشہؓ ام المؤمنین کی روایات کا علم رکھتی تھیں۔

حدیث کے مدون اول محدثین کے نزدیک امام ابن شہاب زہری متوفی سنہ ۱۲۴ھ تسلیم کئے گئے ہیں[1]۔ یہ خلفائے بنی اُمیہ کے درباروں میں بہت معزز تھے اور ان ہی کے حکم سے انھوں نے حدیثیں لکھیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ہم کو حدیثوں کا لکھنا گوارا نہ تھا لیکن ان خلفا نے مجبور کر کے لکھوایا[2]۔

امام زہریؒ کے بعد ابن جریج نے مکہ میں، محمد بن اسحٰق اور مالک بن انس نے مدینہ میں، ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں، سفیان ثوریؒ نے کوفہ میں، اوزاعی نے شام میں، معمر نے یمن میں، ہشیم نے واسط میں، جریر نے رے میں، اور ابن المبارک نے خراسان میں، جو سب کے سب ایک ہی زمانہ

---

[1] توجیہ النظر ص ۷۔ [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸

Marfat.com

ہیں تھے، حدیث کی کتابیں مدوّن کیں۔

یہ جملہ حضرات دوسری صدی ہجری کے ہیں، لیکن ان کی کتابوں میں سے جہاں تک علم ہے سوائے موطا امام مالک متوفی ۱۷۹ھ کے اور کوئی کتاب اُمت کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ اس کے بھی مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک حدیثیں ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ امام مالک جب تک زندہ تھے ہر سال اس میں سے کچھ حدیثیں ساقط کر دیتے تھے۔[1] یہی وجہ ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں روایات کی تعداد مختلف نظر آتی ہے۔

ان ابتدائی تالیفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں، صحابہ کے اقوال اور تابعین کے فتاوے سب ملے جلے تھے۔ بعد کے لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو الگ مدوّن کرنا شروع کیا۔ اس قسم کی تالیفیں مُسند کہی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی مسند عبداللہ بن موسیٰ نے تیسری صدی ہجری کے آغاز میں لکھی پھر مسدد بصری، اسد بن موسیٰ اور نعیم بن حماد وغیرہ نے۔ ان کے بعد کے طبقے نے بھی ان ہی کی پیروی کی، مثلاً امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ۔ چوتھے طبقہ میں امام بخاریؒ متوفی ۲۵۶ھ نے صرف صحیح حدیثوں کے مدوّن کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد امام مسلمؒ نیشا پوری متوفّی ۲۶۱ھ نے بھی ان

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۷۔

Marfat.com

ہی کی پیروی کی۔ یہ دونوں کتابیں صحیحین کہی جاتی ہیں۔ اس زمانہ سے کتابتِ حدیث محدثین کا عام مشغلہ ہوگیا اور مختلف نوعیتوں سے اس کی اس قدر کتابیں لکھی گئیں جن کا شمار مشکل ہے۔

یہاں غور کے قابل یہ امر ہے کہ حدیثوں کی اگر دینی حیثیت ہوتی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس شدت کے ساتھ اس کی کتابت کو نہ روکتے، بلکہ اس کے خلاف اس کی حفاظت کی کوشش کرتے۔

وضع حدیث

ہرچند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باربار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے"۔ اور یہ قول اتنے صحابہ سے مروی ہے کہ بعض محدثین نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کردیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے بھی ایسے لوگ تھے جو اسی زمانے سے جھوٹی حدیثیں بیان کرنے لگے۔ توجیہ النظر صفحہ ۲۴۶ میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ ہی میں ان کے اوپر جھوٹ بولا گیا اور عصر صحابہ میں بھی منافقین اور مرتدین تھے۔

علاوہ منافقین اور مرتدین کے عہد صحابہ میں جب روایتیں عوام میں پھیلیں تو مبالغہ اور کذب ان میں شامل ہوگیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ "بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ انھوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ بشیر نے پوچھا کہ کیا بات ہے جو آپ میری روایتیں نہیں

Marfat.com

سنتے ؟ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ اگر کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بیان کرتا تو ہم اس کی طرف لپکتے اور کان لگا کر سنتے، مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں کرنی شروع کر دیں، اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

صحابہ کے بعد بتدریج کذابین اور وضاعین کی کثرت ہوتی گئی، کیونکہ بنی امیہ کے زمانے میں سلطنت اور مذہب میں تفریق ہو جانے کے باعث اہلِ روایت کے سروں پر فاروقی دُرّہ نہ رہا اور ان کو موقع ملا کہ آزادی کے ساتھ سچی یا جھوٹی جس قسم کی روایتیں چاہیں بیان کریں۔ خلفائے بنی اُمیہ بالعموم حدیث کو بہ نسبت قرآن کے اپنی سلطنت اور استبداد کے لئے زیادہ موجبِ عافیت سمجھتے تھے۔ انھوں نے خود حضرت علیؓ کو برسرِ منبر بُرا کہنے کی رسم ڈالی تھی اور سینکڑوں حدیثیں ان کے مثالب اور امیر معاویہ وغیرہ کے مناقب میں وضع کرائی تھیں۔ عہدِ عباسی میں تو ایک ایک خلیفہ کی پیشین گوئی اور مدح کی حدیثیں وضع ہوئیں۔ یہاں تک کہ یہ حدیث بھی پھیلائی گئی کہ کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان نہیں داخل ہوتا، جب تک کہ حضرت عباس اور ان کی اولاد سے محبت نہ رکھے[1]۔ اور بنی اُمیہ کے خلاف تو اُن کے دعاۃ آغازِ تبلیغ ہی سے حدیثیں گھڑتے تھے۔ اس عہد میں کذب اور وضع کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ ہزاروں پیشہ ور کذاب پیدا ہو گئے جن کا رات دن

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۷۔

Marfat.com

یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں۔

بیشتر وضّاعین اپنی وعظ گوئی اور قصّہ خوانی کی وجہ سے عوام پر اس قدر اثر رکھتے تھے کہ نہایت مقدّس اور بزرگ سمجھے جاتے تھے اور ائمہ حدیث ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں شعبی کا جو تابعین میں کوفہ کے سب سے بڑے امامِ حدیث تھے، بیان نقل کیا ہے کہ "مَیں ایک مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ اس میں ایک دراز رِیش واعظ کھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا کہ" اللہ نے دو صُور پیدا کئے ہیں، ہر ایک دو دو بار پھونکا جائے گا۔ میں نے جلدی سے نماز ختم کر کے اس سے کہا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور جھُوٹی حدیثیں نہ بیان کر۔ صُور تو صرف ایک ہی ہے۔ وہ خفا ہوا اور بولا کہ کیسا فاجر آدمی ہے کہ بڑے بڑے آدمیوں کو جھٹلاتا ہے۔ اس کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ عوام مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے اور جب تک مجھ سے اقرار نہ لے لیا کہ اللہ نے تیس صُور پیدا کئے ہیں، اس وقت تک نہ چھوڑا۔

موضوعاتِ کبیر میں مُلّا علی قاری نے لکھا ہے کہ ایک قصّہ گو نے مقامِ محمود کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے۔ امام ابن جریر طبری نے اس کی مخالفت کی اور اپنے دروازے پر لکھ دیا کہ اللہ کا کوئی ہم نشین نہیں ہے۔ بغداد کے لوگ اس پر بگڑ گئے اور امام موصوف کے دروازے پر اس قدر پتھراؤ کیا کہ اس کا مُنہ ڈھک گیا۔

Marfat.com

امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معین نے جو ائمہ حدیث میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں، ایک بار بغداد کے محلہ رصافہ میں نماز پڑھی مسجد میں ایک قصاص (قصہ گو) نے تقریر شروع کی کہ میں نے سنا احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے انھوں نے معمر سے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے حضرت انسؓ سے اور انھوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جب کوئی بندہ لاالہ الا اللہ کہتا ہے تو اللہ اس کلمہ کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پر زمرد کے۔ آخر تک تقریباً بیس ورق کی روایت. اس طویل داستان کو سن کر دونوں حضرات نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا. پھر یحییٰ بن معین نے قصاص کو اپنی طرف بلایا اور پوچھا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے؟ اس نے کہا کہ یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل سے۔ انھوں نے کہا کہ میں یحییٰ ہوں اور یہ ابن حنبل۔ ہم دونوں میں سے کسی نے آج سے پہلے اس روایت کو سنا تک نہیں. تم کو اگر جھوٹ بولنا ہی تھا تو کسی اور کا نام لیا ہوتا. اس نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے. آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ پوچھا یہ کیونکر؟ بولا کہ سترہ یحییٰ بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل، جن سے میں روایت کرتا ہوں، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دنیا میں بس ایک تم ہی یحییٰ بن معین ہو؟ یہ سن کر آستین منہ پر رکھ لی اور چپ چاپ چلے آئے[1]

---

[1] موضوعات کبیر

Marfat.com

ان مذکروں اور واعظوں کی مقبولیت اس قدر تھی کہ جمہور ان ہی کو اپنا ہادی سمجھتے تھے اور ان ہی کی بات مانتے تھے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی والدہ کا قصّہ ہے کہ انھوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب نے اس کا جواب دیدیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اُس وقت تک نہیں مانوں گی جب تک کہ مسجد کوفہ کا قصاص زرعہ اس کی تصدیق نہ کرے۔ چنانچہ امام صاحب ان کو خود ساتھ لیکر گئے اور جب زرعہ نے کہدیا کہ فتویٰ صحیح ہے، تب انھوں نے تسلیم کرلیا۔

امام ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں جعفر بن حجاج سے نقل کیا ہے کہ محمد بن عبداللہ نے موصل میں پہنچکر عجیب وغریب حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ علمائے حدیث کو جب خبر ہوئی تو ان میں سے چند نے چاہا کہ چل کر اس کی تردید کردیں۔ وہ ایک مجمع میں سرگرم تقریر تھا، جب علماء کو اپنی طرف آتے دیکھا تو معاملہ کو سمجھ گیا۔ فوراً ایک روایت حضرت جابر سے بیان کرنی شروع کردی کہ "قرآن کلام اللہ ہے اور غیر مخلوق"۔ اب عوام کے خوف سے ان علماء کو جرأت نہ ہوسکی کہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہہ سکیں[1]۔

یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے خلاف اگر ائمہ حدیث کچھ کہتے تو ان کے معتقدین آکر بحث ومجادلہ کرتے۔ امام داؤد طائیؒ نے اسی خوف سے روایت

---

[1] کیونکہ اس زمانہ میں یہی بحث چھڑی ہوئی تھی جو عالم قرآن کو غیر مخلوق کہہ دیتا وہ عوام میں مقبول ہوجاتا۔ پھر اس کی کوئی بات قابل تردید خیال نہ کی جاتی۔

Marfat.com

چھوڑ دی تھی اور کہا کرتے تھے کہ مجھے دُکھ ہوتا ہے کہ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور جب میں کچھ لکھوا دیتا ہوں تو میری غلطیاں نکالتے ہیں۔ امام اعمش کہتے تھے کہ واللہ تم لوگوں نے حدیثوں کو رد کر کے میرے حلق میں ان کو عود سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا ہے تم جس کی طرف رُخ کرتے ہو اس کو جھوٹ بلوا کے چھوڑتے ہو، اور ابن مزرع کہا کرتے تھے کہ جب کسی شیخ کو بھاگتا ہُوا دیکھو، سمجھ لو کہ اس کے پیچھے اصحابِ حدیث ہیں[1]۔

سینکڑوں واضعینِ حدیث ایسے بھی تھے جو مخفی طور پر جھوٹی حدیثیں گھڑتے اور اُن کو اپنی جماعت میں پھیلاتے۔ اگر ان کا پایۂ اعتبار کم ہوتا تو بڑے بڑے ثقہ راویوں کے ناموں سے روایت کرتے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اپنے شیوخ کے مشابہ خط میں اپنی مکذوبات چوری سے ان کی کتابوں میں درج کر دیتے۔ کچھ لوگ جہاد اور ثواب کا کام سمجھ کر حدیثیں بناتے تھے۔ روایات کا تو کیا ذکر بعض بعض وضّاعین نے تو حدیث کی پوری پوری کتابیں تصنیف کر ڈالیں، جو اوّل سے آخر تک موضوع ہیں۔ اس قسم کی چند کتابوں کے نام اور ان کے حالات تذکرۃ الموضوعات میں ہیں۔ علّامہ ابن جوزی نے وضع حدیث کے مندرجہ ذیل اسباب لکھے ہیں:

(۱) بعض لوگوں نے جن کے اوپر زُہد غالب تھا، حفظ میں غفلت کی

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۸۱-۱۸۳۔

Marfat.com

اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

(۲) بعض اہلِ علم کی یادداشتیں ضائع ہوگئیں اور انھوں نے مجبوراً حافظہ سے کام لیا اور جو خیال میں آیا کہہ گئے۔

(۳) بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دے دیا تھا، غلط روایتیں کیں۔

(۴) ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے غلط روایتیں کر دیں اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف سمجھا۔

(۵) زنادقہ نے (یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن درپردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے اور عہدِ عباسی میں ان کی تعداد کچھ کم نہ تھی) ایسی حدیثیں گھڑیں جو شریعت کو فنا کرنے والی ہیں[1]۔

(۶) جب مذہبی تفرقہ پیدا ہوئی اور سُنّی، شیعہ، خارجی، قدری، جہمی، مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے، اس وقت ان میں سے اکثر نے اپنی تائید اور دوسروں کی تردید میں حدیثیں وضع کیں۔

(۷) بہت سے عابد و زاہد لوگ ایسے تھے جو عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور بُرے کام سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گھڑتے تھے۔

(۸) بعض کا خیال یہ تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا

---

[1] یہ لوگ مدح کے پیرایہ میں سیرتِ رسولؐ کو معیوب، قرآن کی آیات کو محرف اور شریعت کو ناقص دکھانے نیز اپنے عقائد کو اسلامی تعلیمات میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے، جن کا اثر آج بھی کتب تفسیر و حدیث میں باقی ہے۔

Marfat.com

اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینا جائز ہے اور عملاً ایسا ہی کیا کرتے تھے۔[1]

(۹) خلفاء و اُمراء کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسب منشار روایتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

(۱۰) قصہ گو واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرتے تھے، کیونکہ ان کی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ دس وجوہ ہیں، جن کے باعث مکذوب و مجعول روایتیں اُمت میں پھیلیں، لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں، حدیثیں بنائیں اور کبھی ان کو مخفی اور کبھی علانیہ مشرق سے مغرب تک پھیلایا اور ان سے بھی زیادہ ان جاہ پسندوں نے روایتیں گھڑیں، جو اپنے علم و تقدس کا سکہ جما کر بزرگی اور عظمت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ان وضاعین کی موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی جس کا اندازہ مشکل ہے، کیونکہ یہ وضاعین حدیث کی رگ رگ میں گھس گئے تھے

---

[1] تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ ایک محدث نے آخر عمر میں وضع حدیث سے توبہ کی۔ اس وقت اس نے کہا کہ حدیثوں کو ذرا دیکھ بھال کر قبول کیا کرو، کیونکہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسب منشار پاتے تھے تو اس کو دین بنا لیتے تھے، یعنی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

Marfat.com

اور اس کا کوئی باب اور کوئی شعبہ انھوں نے ایسا نہیں چھوڑا جس میں اپنے حسب منشا، حدیثیں نہ تراشی ہوں۔ اور ایک ایک بیج میں سو سو جھوٹ نہ ملایا ہو۔ پورے بابب کے باب موضوع ہیں[1]۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ ملاحم (پیشین گوئیاں) مغازی (لڑائیاں) اور تفسیر[1]۔ ان تینوں ابواب میں کس قدر حدیثیں ہیں؟ ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود امام موصوف کے ایک رفیق ابو زرعہ کو صرف تفسیر میں ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں یاد تھیں[2]۔

کذب کا تسلط یہاں تک ہوا کہ روایات تو کیا، کئی ایک موضوع صحابی بنا لئے گئے۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۲ میں ہے:

جملہ مورخین متفق ہیں کہ روئے زمین پر سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے وہ حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں جنھوں نے مکہ مکرمہ میں سنہ ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ ان کے بعد چھٹی بلکہ ساتویں صدی ہجری میں طویل العمر صحابہ مخترع کر لئے گئے جن میں سے یہ لوگ ہیں:

جبیر[1] بن حرب۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ امیر عبد الکریم کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ سنہ ۵۷۳ھ میں ان کی زیارت کی تھی۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۲۔ [2] توجیہ النظر ص ۴۔

Marfat.com

ابوعبداللہ[2] صقلی۔ پانچویں صدی ہجری میں تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا ہے، اس لئے لوگ جا جا کر تبرکاً اُن سے مصافحہ کرتے تھے۔

قیس[3] بن تمیم گیلانی۔ ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا، جس کی نسبت مشہور کیا گیا تھا کہ حضرت علیؓ کے خچر نے لات ماری تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔

بابا[4] رتن ہندی، ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ یہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ ۶۳۲ھ میں وفات پائی۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے ان کی زبانوں سے طرح طرح کی روایتیں اُمت میں پھیلائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ سند عالی کے خیال سے ان کو اپنی بیاضوں میں درج کر لیتے تھے[5]۔ علماء کی ذہنیتوں کا حال یہ تھا کہ جب ائمہ حدیث اِن خرافات کا انکار کرنے لگے تو ان کے ساتھ مجادلہ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدالدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے اور حافظ ابن حجر نے جب ان باتوں کی

---

[5] تذکرۃ الموضوعات کے ص۱۰۱ میں علامہ آفاق شہری کا قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر چند "رتنیات" کی صحت پر وثوق نہیں مگر ان کی سند سے برکت حاصل کی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

تغلیظ کی تو علامہ صفدی نے سختی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔

اس مختصر کیفیت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ روایانِ حدیث میں کذابوں اور وضّاعوں کا عنصر کس قدر غالب تھا اور جمہور میں ان کی قدردانی کی کتنی صلاحیت موجود تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ اُمت جس کے پاس قرآن جیسی کامل اور روشن کتاب ہو، کذب کے ایسے تاریک غار میں گر جائے۔

تنقیدِ حدیث

جامعینِ حدیث نے جس وقت حدیثوں کو مدوّن کیا، اس وقت جو کچھ بھی ذخیرہ، روایات کا ان تک پہنچا تھا کتابوں میں لکھ دیا۔ صرف خال خال روایتوں کو جن کا موضوع یا مکذوب ہونا بالکل ہی عیاں تھا، چھوڑ دیا[1]۔ یہ حدثیں اسناد کے ساتھ جمع کی گئی تھیں، یعنی ان راویوں کے ناموں کے ساتھ جن کے ذریعہ سے پہنچی تھیں، اس کے بعد سے تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور صحیح یا غلط کی چھان بین ہونے لگی۔

اس تنقید میں ائمہ حدیث نے دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک متنِ حدیث کو، دوسرے رواۃ کو، موضوع متن کی شناخت کے لئے انھوں نے حسبِ ذیل اصول قرار دیئے:

(۱) عقل کے خلاف ہو۔

(۲) فطرت کے خلاف ہو۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۹

Marfat.com

(۳) قرآن کے خلاف ہو۔

(۴) تاریخ کے خلاف ہو۔

(۵) موقع یا قرینہ کے خلاف ہو۔

(۶) رافضی صحابہ کے یا خارجی اہلِ بیت کے مطاعن میں روایت کرتا ہو۔

(۷) چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔

(۸) واقعہ ایسا ہو جس کے بیان کرنے والے بہت سے لوگ ہو سکتے ہوں مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکیں، کیونکہ جو لوگ حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے، تاکہ کہیں سے گرفت نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں محدثانہ تاویلات کا دروازہ ایسا کھلا ہوا تھا کہ جہاں کوئی روایت عقل یا قرآن وغیرہ کے خلاف معلوم ہوتی، فوراً مطابقت پیدا کر لی جاتی۔

لہٰذا یہ اصول جو غلط روایتوں کو پہچاننے کے لئے مقرر کئے گئے تھے، تقریباً بے کار ثابت ہوتے۔ اس لئے ان نقادوں نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی جانچ پر زیادہ مدار رکھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حضرات نبی تو تھے ہی نہیں کہ سو ڈیڑھ سو سال سے ہزار ہا وضاعین اور کذابین جو پیدا ہوتے چلے آ رہے

Marfat.com

تھے اور جن میں سے اکثر جمہور میں مقبول اور محترم بھی تھے ان کو الہامِ الٰہی سے شناخت کر لیتے۔ ان کے پاس ان کے پہچاننے کا جو کچھ ذریعہ تھا وہ بھی روایات ہی کا تھا، یعنی ہر ایک راوی کے صدق و کذب کی بنیاد انھوں نے ان روایات پر رکھی جو اس کے متعلق لوگوں سے پہنچی تھیں۔

عہدِ صحابہؓ نیز تابعین میں ضعفاء اور کذابین کم تھے، اس کی وجہ سے ان کی بابت کلام بھی کم کیا گیا ہے۔ صرف امام شعبی، ابنِ سیرین اور سعید بن المسیب سے بعض کے متعلق جرح مذکور ہوتی ہے۔ دوسری صدی ہجری کے وسط میں امام اعمش اور مالک وغیرہ نے ضعفاء کا کھوج لگانا شروع کیا۔ پھر معمر، ہشام دستوائی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابن الماجشون اور حماد بن سلمہ وغیرہ نے ان کے بعد یحییٰ بن سعید القطان متوفی ۱۹۸ھ اور ابن مہدی رجال کے مستند امام ملنے گئے، لیکن ان کے زمانے تک یہ علم زبانی تھا، تیسری صدی ہجری سے اس میں تدوینِ کُتب شروع ہوئی، جن میں ایک ایک راوی کے حالات جمع کئے گئے اور اس کے اوپر جرح و تعدیل ہونے لگی اس عہد کی نامور شخصیتیں دو ہیں: امام یحییٰ بن معین متوفی ۲۳۳ھ اور احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ جن کے بعد یہ سلسلہ پھیل گیا اور اس فن کے سینکڑوں امام ہوئے اور اس میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں[1]۔ مگر چونکہ صدق و کذب

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۱۴

Marfat.com

باطنی صفات میں سے ہیں جن کے اوپر یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی، اس وجہ سے رواۃ کے متعلق بے حد اختلافات ہوتے۔ ہزاروں ہیں جن کو ایک اگر سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا۔

رہے ظاہری اوصاف یعنی زہد وعبادت وغیرہ تو ان کے متعلق خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ امام یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ اہلِ صلاح وخیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اہلِ خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔ ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم وزہد اور عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے معاملہ میں بھی گواہی دے تو میں قبول نہیں کروں گا۔[۱] اس لئے مجبوراً توثیق کی بنیاد محض مقبولیت اور شہرت پر رکھی گئی اور مقبولیت وشہرت کا یہ حال ہے کہ جو لوگ مسلم امام ہیں وہ بھی جرح سے محفوظ نہیں ہیں، بلکہ جب ہم ان کے متعلق ان کے ہم عصر اماموں کی رائیں سنتے ہیں تو ہم کو ان کی امامت میں شک ہونے لگتا ہے۔ اس قسم کے چند اقوال حافظ ابن عبد البر کی کتاب مختصر جامع بیان العلم کے صفحہ ۱۹۶ سے نقل کرتا ہوں:

۱۔ توجیہ النظر ص ۲۵۔

Marfat.com

امام حماد بن ابی سلیمانؒ جو امام ابو حنیفہؒ کے استاد ہیں، جب مکہ کے سفر سے عراق میں واپس لئے اور لوگ ان کے پاس جمع ہوتے تو کہا کہ عراقیو! اللہ کا شکر کرو ہیں نے علمائے حجاز کو دیکھا واللہ تمہارے بچے بلکہ بچوں کے بھی بچے ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں" اور یہ علمائے حجاز کون تھے؟ عطا بن ابی رباح، طاؤس، عکرمہ اور مجاہد وغیرہ جو سارے عالم اسلامی میں مستند مانے جاتے ہیں۔

انہی حماد کے استاد ابراہیم نخعی کا ذکر امام شعبی کے سامنے آیا تو انھوں نے کہا کہ وہ رات کو آکر ہم سے پوچھتا ہے اور صبح کو فتوے دیتا ہے۔ امام ابراہیم نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ شعبی کذاب ہیں وہ مسروق سے روایت کرتے ہیں، حالانکہ ایک لفظ بھی ان سے نہیں سنا ہے۔

امام مغازی محمد بن اسحٰق کے پاس امام مالکؒ کا ذکر ہوا تو کہا کہ ان کی روایتیں میرے سامنے پیش کرو، میں ان کا بیطار ہوں۔ جب امام مالکؒ نے یہ بات سُنی تو فرمایا کہ ابن اسحٰق دجّال ہے۔

ایک بار امام مالکؒ سے کسی نے علمائے عراق کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ "ان کو بمنزلہ اہلِ کتاب کے سمجھو، نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب" (یہ علمائے عراق کون تھے؟ حنفیہ سے پوچھئے)

امام ابو حنیفہؒ امام اعمشؒ کی بیمار پرسی کو گئے تھے۔ اٹھتے وقت کہا کہ اگر میرا آنا آپ کے اوپر گراں نہ گذرتا تو میں اس سے زیادہ عیادت کے لئے حاضر ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ تمہارا تو اپنے گھر میں رہنا بھی میرے اوپر گراں ہے، چہ جائیکہ یہاں آنا۔ باہر نکل کر امام ابو حنیفہؒ

Marfat.com

نے کہا کہ اعمش کی نہ کبھی نماز ہوتی نہ روزہ۔

اس قسم کی باتوں کے متعلق محدثین یہ کہتے ہیں کہ ہم عصر علماء میں باہمی رقابت رہا کرتی ہے، اس وجہ سے ان کے اقوال ایک دوسرے کی نسبت قابل اعتنا نہیں ہیں اور ان سے کسی کی امامت میں فرق نہیں آتا۔ میں اس جواب کی صحت پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ان ائمہ کی رایوں پر جب معاصرانہ چشمک غالب آجاتی تھی تو دوسرے جذبات کیوں نہیں غالب آسکتے تھے۔ ہم تو صاف دیکھ رہے ہیں کہ رواۃ کی توثیق صرف ان کے صدق کی بنا پر نہیں کی گئی ہے بلکہ استادی شاگردی اور ہم خیالی کے عواطف و میلانات بھی اس میں شریک ہیں۔ جہاں کسی امر میں اختلاف ہوتا ہے وہاں بڑے سے بڑے ثقہ پر بھی جرح ہو جاتی ہے۔ حارث ہمدانی مسلّمہ طور پر ثقہ تھے، جن کا کبھی جھوٹ ثابت نہیں ہوا مگر چونکہ حضرت علیؓ کی محبت کا اظہار کرتے تھے، اس وجہ سے شعبی نے ان کو کذاب کہہ دیا۔[1] اور پھر رفتہ رفتہ وضّاعین میں شمار کئے گئے۔ بہت سے لوگوں نے امام ابو حنیفہؒ کے متعلق بعض اختلافات کی بنا پر کلام کیا۔ ابن ابی ذئب اور عبدالعزیز بن سلمہ وغیرہ نے چند مخصوص مسائل کی وجہ سے امام مالکؒ پر جرح کی۔ خود یحییٰ بن معینؒ نے امام شافعیؒ کو غیر ثقہ قرار دیا۔[2] اسی طرح سینکڑوں ائمہ ہیں جو محض اختلافاتِ خیال کے باعث

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۹۷۔ [2] ایضاً ص ۲۰۱

Marfat.com

مجروح کئے گئے۔ اسی کا ماتم کرتے ہوتے ہارون الرشید کے عہد کے نامور شاعر ابوالعتاہیہ نے کہا:

بکی شجوہ الاسلام من علمائہ فما اکترثوا لما رأوا من بکائہ
فاکثرھم مستقبح لصواب من یخالفہ مستحسن لخطائہ
فایھم المرجو فینا لدینہ وایھم الموثوق فینا لرائہ

(اسلام اپنے علماء کے دکھ سے رو پڑا اور انھوں نے اس کو روتے دیکھ کر بھی پروا نہ کی۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے مخالف کی صحیح بات کو بھی بری اور اپنی غلط بات کو بھی اچھی سمجھتے ہیں، لہذا ان میں سے کس سے دین کی امید رکھیں اور کس کی رائے پر اعتماد کریں۔)

الغرض جرح وتعدیل کا فن سرتاسر قیاسی ہے اور اس قیاس میں بھی جذبات اور عواطف کے علاوہ تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ:

امام احمد بن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایتوں کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایتوں میں نرمی۔

شروع سے آخر تک ان میں نرم اور گرم دو فریق رہے ہیں۔ طبقۂ اوّل میں امام شعبی سخت تھے اور سفیان ثوری نرم۔ دوم میں ابن مہدی نرم تھے اور یحیٰی بن سعید القطان سخت۔ سوم میں احمد بن حنبل بمقابلہ ابن معین کے نرم تھے اور چہارم میں ابوحاتم بمقابلہ امام بخاری کے سخت۔

Marfat.com

اس لئے رواۃ کی توثیق یا تضعیف تمام تر تخمین پر مبنی ہے اور صرف حدیثیں ظنّی نہیں ہیں بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنّی ہے اور یہ وہ بات ہے جس کو خود محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ ملّا علی قاری موضوعات کبیر صفحہ ۱۶ میں لکھتے ہیں:

> یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتی ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

اس لئے کسی حدیث کی نسبت یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ قولِ رسولؐ ہے بلکہ صرف یہ کہ وہ ایک قول ہے جو رسول کی طرف منسوب ہے خواہ اس کی نسبت صحیح ہو یا غلط۔ امام مالکؒ یہ آیت پڑھا کرتے تھے[۱]:

اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ ۔

ہم تو صرف گمان کرتے ہیں ہم کو یقین نہیں حاصل ہے

پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ رجال اسناد کے ثقہ ثابت کرنے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ متنِ حدیث بھی صحیح ہو، اس لئے کہ وضّاعین اپنی موضوعہ روایات کے ساتھ معتبر سند لگا دیتے تھے تاکہ کوئی ان کو غلط نہ کہہ سکے۔ ان کے پاس ستره[۲]

---

۱ مختصر جامع بیان العلم ص ۱۱۴

Marfat.com

یحییٰ بن معین اور وغیرہ احمد بن حنبل ہوتے تھے۔ لہٰذا پہلا اصول تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ جو روایت جس سند کے ساتھ مروی ہے اس کی صحت کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور دوسرا یہ کہ جس کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ایک کا قول کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، اس کی کوئی روایت نہ تسلیم کی جائے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے برخلاف اس تدلیس کے عیب میں بڑے بڑے ائمہ مبتلا ہیں مثلاً امام حسن بصریؒ، مکحول شامی، سفیان ثوری، سفیان ابن عینیہ، ابراہیم نخعی مالک انس اور دار قطنی وغیرہ[1]۔ اس لئے روایات کی تنقید کا یہ طریقہ بھی بے کار ثابت ہوا۔

علاوہ بریں یہ تقویٰ کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ کیونکہ جس اُمت کے ہاتھ میں قرآن جیسی کتاب موجود ہے جس میں "الیوم اکملت لکم دینکم" فرما کر اللہ نے دینِ اسلام کو مکمل کر دیا ہے، اس کو دین کی تلاش کے لئے کب جائز ہے کہ مرے ہوئے ائمہ اور رواۃ کے گڑے مُردے اُکھیڑ کر جرح و تعدیل کے مسلخ میں لاتے اور ہر ایک کی پوست کشی کر کے اس کے صدق و کذب کا پتہ لگانے کی کوشش کرے، وہ بھی محض لوگوں کے بیانات سے۔ چنانچہ امام یحییٰ بن معین نے جب سب سے پہلے تاریخ الرجال لکھی اور اس میں سینکڑوں رواۃ حدیث کو جہاں ثقہ و صادق قرار دیا، وہاں ہزاروں کو کذاب اور دجال

---

[1] طبقات المدلسین لابن حجر۔

Marfat.com

کہا۔ اس وقت علمائے اُمت پر یہ امر اس قدر شاق گذرا کہ انھوں نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ بکر بن حماد شاعر نے کہا:

لابن معین فی الرجال مقالۃ ۔۔۔ سیسئل عنہا والملیک شہید

فان کان حقا قولہ کان غیبۃ ۔۔۔ وان کان زورًا فالقصاص شدید

(ابن معین نے لوگوں کے بارے میں باتیں کہی ہیں، جن کی بابت اللہ کے سامنے ان سے سوال کیا جائے گا۔ اگر وہ سچی ہیں تو غیبت ہیں اور اگر جھوٹی ہیں تو سزا سخت ہوگی)[1]

لیکن محدثین کو چونکہ حدیثوں کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لئے ایک معیار کی ضرورت تھی، اس وجہ سے انھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اس سلسلے کو بڑھا کر ایک مستقل فن بنا لیا اور آج تو وہ بڑے فخر کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "مسلمان اس خصوصیت میں ممتاز ہیں کہ انھوں نے اپنے پانچ لاکھ علماء کے حالات محفوظ رکھے"۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے ایسے حضرات کے سوا جنھوں نے اعلائے کلمۃ الحق یا ملت کی تعمیر میں کارنامے چھوڑے ہیں، بقیہ کے متعلق جن کا کام سوائے روایت کشی کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ دریافت کرنا کہ

---

[1] مگر شاعر کے خیال کے خلاف ایک محدث نے یحییٰ بن معین کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ کیسی گذری؟ انھوں نے کہا کہ اللہ نے مجھکو چار سو حوریں بخشدیں۔ کتاب الاسماء جلد ۱ صفحہ ۱۵۶

Marfat.com

ان کا نام کیا تھا، ان کی کُنیت کیا تھی، ان کے کون کون اُستاد تھے اور کون کون شاگرد، ان کی کس قدر روایتیں صحیح ہیں اور کس قدر غلط وغیرہ وغیرہ کوئی مفید یا قابلِ فخر تاریخی علم نہیں ہے بلکہ ملت کے لئے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے جو روایت پرستی کے سبب سے ملی ہے۔

اصُولِ حدیث

اصولِ حدیث سے یہاں میری مُراد اس کی اصطلاحات نہیں ہیں، بلکہ وہ قواعد ہیں، جن کو محدثین نے روایت میں مرعی رکھا۔ یہ اصول تقریباً سب کے سب ناقص اور نظری حیثیت سے نہایت کمزور ہیں۔ اس موقع پر میں ان میں سے صرف اُن اصُول کو لیتا ہوں جن سے حدیثوں کی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

پہلا اصول روایت بالمعنٰی کا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایتیں کی گئی ہیں وہ بلفظہٖ نہیں ہیں بلکہ بالمعنٰی ہیں۔ اور بلفظہٖ ہو بھی کیسے سکتی تھیں، کیونکہ حضورؐ کی مجلس میں جو صحابہ موجود ہوتے تھے، وہ نہ آپ کی باتیں لکھا کرتے تھے، نہ یاد کرکے سنایا کرتے تھے۔ اور ان کو بیان کرنے کا موقع بھی ایک مدّت کے بعد پیش آیا۔ اس وجہ سے ان کے لئے انہی الفاظ کو نقل کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے متعذر تھا۔ لہٰذا وہ اپنے الفاظ میں بیان کرنے لگے۔ اور اس کو محدثین نے اصولاً

لہ توجیہ النظر ص ۳۰۰۔

Marfat.com

جائز قرار دے لیا اور روایت بالمعنیٰ رائج ہوگئی[۱]۔ حالانکہ بعض صحابہ حضرت ابن عمرؓ جیسے اس کو ناجائز سمجھتے تھے اور وہ یا تو زبان بند رکھتے یا انہی روایات کو بیان کرتے تھے جن کے الفاظ ان کو یاد ہوتے تھے، کیونکہ لفظوں کے بدل جانے سے معانی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوجاتی ہے جو روایت حدیث میں یقیناً تقویٰ کے خلاف ہے۔ حضرات عمران بن حصین نے کہا کہ دوسروں کی طرح اگر میں بھی روایتیں بیان کرنی چاہوں تو دو دن اور دو رات تک مسلسل بیان کر سکتا ہوں، کیونکہ جس طرح ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنی ہیں میں نے بھی سنی ہیں مگر ڈرتا ہوں کہ انہی غلطیوں میں پڑجاؤں گا جن میں دوسروں کو پڑتے ہوتے دیکھ رہا ہوں[۲]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے الفاظ کی تبدیلی سے معانی بدلنے لگے تھے اور اختلاف پیدا ہونے لگے تھے اور اہلِ نظر و صلاح اس سے عبرت پکڑتے تھے۔

تابعین میں سے بعض ائمہ مثلاً ابن سیرین، مالک، قتادہ اور ابو بکر رازی کے سوا بالعموم محدثین روایت بالمعنیٰ ہی کرتے تھے۔ امام سفیان ثوری نے کہا ہے کہ:

> اگر میں تم سے کہوں کہ میری روایت کے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے، تو مجھ کو سچا نہ جانو، میں تو بالمعنیٰ

۱؎ توجیہ النظر ص ۳۰۰ ۲؎ ایضاً ص ۱۱

Marfat.com

روایت کرتا ہوں[1]۔

یہی دوسرے محدثین بھی کہا کرتے تھے۔ قاضی بدرالدین نے اپنے استاد ابن مالک سے کہا کہ حدیثیں بالمعنیٰ مروی ہیں اور رواۃ زیادہ تر عجمی ہیں، جو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں پھر ہم کس طرح معلوم کریں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا اصل مفہوم کیا تھا؟ وہ چپ رہے اور کچھ نہیں بولے[2]۔

ابوحیان نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ائمہ نحو نے جس قدر استشہاد کیا ہے، آیات سے کیا ہے، روایات سے نہیں کیا، کیونکہ ان کو الفاظِ حدیث پر وثوق نہیں تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں[3]۔ اگر کسی روایت میں بعینہٖ الفاظ محفوظ ثابت ہو جائیں تو یہ اتفاقی امر ہے۔

روایات کے بالمعنیٰ ہونے سے حدیثوں کی منزلت میں بہت فرق آ گیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت صرف معنوی رہ گئی اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ رواۃ کے الفاظ کہاں تک آپ کے بیان کے مدعا کے مطابق ہیں، اس لئے کہ کبھی کبھی صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے پورے کلام کا مفہوم بدل جاتا ہے اور یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ ایسی صورت میں الفاظِ حدیث سے کسی خاص مقصد پر استدلال نہایت بے بنیاد ہے، کیونکہ معلوم نہیں کہ اصلی لفظ کیا تھا؟

---

[1] توجیہ النظر ص ۳۱۳ [2] ص ۳۱۳، ۱۲ [3] ص ۳۱۳، ۱۲

Marfat.com

دوسرا اصول خبرِ منفرد کی مقبولیت کا ہے، یعنی محدثین نے اس روایت کو جس کا راوی کسی درجہ میں صرف ایک ہی ہو، لیکن ان کے معیار کے مطابق ثقہ ہو، مقبول قرار دیا۔ علمائے محققین نے اسی وقت اس کی مخالفت کی۔ ابراہیم بن اسمٰعیل نے کہا کہ روایت بمنزلہ شہادت کے ہے، اس لئے جب تک ہر درجہ میں کم سے کم دو راوی نہ ہوں قبول نہیں کی جا سکتی۔ معتزلہ اور خاص کر ابو علی جبائی نے بھی نہایت سختی کے ساتھ ٹوکا، مگر محدثین نے کوئی التفات نہیں کیا، کیونکہ اس سے احادیث کے ایک بڑے حصہ سے ان کو دستبردار ہو جانا پڑتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ اور رازیؒ نے باوجود فلسفی اور معقولی ہونے کے بھی ان کے ساتھ موافقت کی ہے، حالانکہ قرآن میں جب معمولی لین دین پر جو دنیاوی امور ہیں، دو مسلمانوں کو گواہ بنا لینے کا حکم دیا گیا ہو تو دینی امور میں کیوں دو گواہوں کی ضرورت نہیں ہے؟

خود روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین گواہ طلب کرتے تھے۔ قبیصہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی، انھوں نے فرمایا کہ میں کلام اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو سدس دلوایا ہے۔ فرمایا کہ کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں۔ اس وقت اس کو ایک سدس دلوا دیا۔

Marfat.com

اسی طرح حضرت عمرؓ کے دروازے پر ابو موسیٰؓ نے آواز دی، جب جواب نہ ملا تو واپس چلے۔ اتنے میں فاروق اعظم اندر سے نکل آتے اور پوچھا کہ آواز دینے کے بعد پلٹے کیوں؟ کہا کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ جب تین بار پکارنے کے بعد جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ۔ فرمایا کہ گواہ لاؤ، ورنہ اچھی طرح خبر لوں گا۔ ابو موسیٰ کا رنگ خوف سے اُڑ گیا بھاگے ہوئے مسجد کی طرف صحابہ کرام کے پاس آئے، واقعہ سنایا اور کہا کہ کسی نے اگر سنا ہو تو میرے ساتھ چلے، چنانچہ ایک صحابی نے جا کر شہادت دیدی تب حضرت عمرؓ نے ان کو چھوڑا[1]۔

مگر عہدِ صحابہ میں عینی شہادت کا ملنا ممکن تھا، اس لئے اُس وقت یہ طرزِ عمل بالکل حق بجانب تھا، لیکن زمانہ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہو گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُمت کے جملہ افراد پر جن کی تعداد کروڑوں بلکہ ممکن ہے اربوں ہو جائے، ایک عقیدہ یا عمل کی پابندی عائد کرنی چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے، اس لئے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ دو شاہدِ عدل پیش کرے جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سُنا ہے۔ پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ بلا ان کے اصولِ عدالت اور قانونِ شریعت کے مطابق اس کا قول تسلیم کے قابل نہیں۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۲

Marfat.com

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس جس قدر ذخیرہ روایات کا ہے اس میں ایک روایت بھی ایسی نہیں جو اس طرح شہادتوں سے ثابت کی گئی ہو یا کی جاسکتی ہو؟ اس لئے تمام روایتیں غیر یقینی ہیں۔ روایت کی صرف ایک قسم یقینی ہوسکتی تھی، یعنی متواتر جس کی تعریف حافظ ابن حجر نے نخبۃ الفکر میں یہ لکھی ہے:

> ایک تعداد کثیر جس کا عادتاً جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہو اس کو روایت کرے اور ابتدا سے انتہا تک ان کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو اور اس کی بنا محسوس پر ہو اور اس سے بداہتہً سامع کو یقین حاصل ہو جائے۔

یعنی خبر کے متواتر ہونے کے لئے چار شرطیں ہیں:

(۱) اس کے راویوں کی تعداد اتنی کثیر ہو کہ ان کے کذب پر باہم اتفاق کر لینا عادۃً ناممکن ہو۔

(۲) ابتدا سے انتہا تک ہر درجہ میں اس کے راویوں کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو۔ کسی ایک درجہ میں بھی اس سے کم ہوگی تو وہ متواتر نہ رہیگی۔

(۳) خبر متواتر کا مبنیٰ محسوس ہو، اگر غیر محسوس ہوگا تو متواتر نہ ہوگی۔ مثلاً مکہ ایک شہر ہے۔ اس کو بیان کرنے والے خواہ ہزار ہی آدمی کیوں نہ ہوں، یہ خبر متواتر اور یقینی ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر کروڑوں آدمی کہیں کہ عیسیٰ خدا

Marfat.com

کے بیٹے ہیں تو یہ خبر متواتر نہ ہوگی، کیونکہ اس کا مبنیٰ غیر محسوس اور محض اعتقادی ہے۔

(۴) اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔

ایسی حدیث جس میں یہ چاروں شرطیں پائی جائیں، متواتر اور مفید یقین ہوگی اور اسی کو علماءِ معقول یعنی منطقیوں نے یقینیات میں شمار کیا ہے، لیکن اس قسم کی متواتر حدیث کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن صلاح نے جو باوجود اس کے کہ حدیث کے معاملہ میں نہایت خوش اعتقاد ہیں، لکھا ہے کہ اس تعریف کے مطابق متواتر حدیث کا ملنا مشکل ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اُن کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ایسی حدیثیں مل سکتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جن چار حدیثوں کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے ان میں تواتر لفظی نہیں بلکہ معنوی ہے[1]۔ علاوہ بریں انھوں نے تواتر کا مفہوم ہی بدل دیا ہے اور مشہور حدیث کو متواتر قرار دینے کی کوشش کی ہے جس کے یقینی ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی صحابی یا امام نے کوئی روایت کی، جس کے بعد اس کے بیان کرنے والے حد شمار سے زیادہ ہو گئے تو وہ متواتر نہ ہوگی، کیونکہ اس میں رواۃ کی تعداد اوّل سے آخر

---

[1] توجیہ النظر ص ۴۴

تک یکساں نہیں ہے۔ جو لوگ فرطِ عقیدت سے صحیحین کی روایتوں کو متواتر کہنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً امام تیمیہ یا ابن صلاح، ان کے ساتھ اس حد تک توموافقت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مصنفین تک متواتر ہیں، مگر ڈھائی سو سال کا زمانہ جو ان سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہے، اس میں خبر واحد ہی تھیں۔ زیادہ صاف لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ خبر متواتر وہ ہے جس سے بداہتہً یقین حاصل ہو اور وہ دعویٰ، دلیل اور سند کی بھی محتاج نہ ہو اور ایسی کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں اور ائمہ اصول نے تصریح کی ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں ہے۔

دلائل حدیث

محدثین نے حدیث کی دینی حیثیت پر آیاتِ قرآنی سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے، اس لئے ان کے جوابات بھی لکھنے ضروری ہیں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجائے۔

امام شافعیؒ (متوفی سنہ ۲۰۴ھ) نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے جو حدیث کو دینی حجت نہیں مانتی تھی اور ان میں سے ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے۔ اس نے امام موصوف سے سوال کیا کہ:

قرآن کریم نے جو فرائض اُمت پر عائد کئے ہیں، ان میں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو، کسی کو خاص، کسی کو لازم اور کسی کو مباح۔

Marfat.com

اور یہ سب کچھ ان روایات کی بنا پر کرتے ہو جو ایسے لوگوں سے مروی ہیں، جن میں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا، نہ ان سے ملے اور باوجود ان کی عدالت اور ثقاہت کے قائل ہونے کے بھی تم ان میں سے کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے ہو کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے۔ پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو۔ کہ ان کی بنا پر احکام الٰہی میں تفریق کر ڈالتے ہو۔

امام صاحب نے جو جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سُنّت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سنت وہ ہے جس کو قرآن نے یعلمھم الکتٰب والحکمۃ میں حکمت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ نیز دوسری آیت ہے:

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (۵۹)

رسول جو کچھ تم کو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے۔ اس کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سُن کر اس نے اپنے قول سے رجوع کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعیؒ کی کرامت ہی سمجھتے ہیں ورنہ ان سے تو اس کے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہ ہوا، کیونکہ اس کا اعتراض نفس روایت اور ذریعہ روایت کے متعلق تھا کہ وہ مشتبہ ہے اس لئے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے

Marfat.com

قابل نہیں ہے۔
علاوہ بریں حکمت کا مفہوم جو انھوں نے حدیث کو قرار دیا کسی طرح صحیح نہیں حکمت ایک عام لفظ ہے جس کے معنی ہیں، دانائی کی باتیں۔ خود قرآن کی صفت بھی حکیم ہے، یعنی اس میں حکمت کی باتیں ہیں جیسا کہ جابجا آیات میں تصریح ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۴/۱۱۳)

اور اللہ نے تجھ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی۔

سورۃ بنی اسرائیل میں تورات کے احکام عشرہ کے مقابل تیرہ احکام نازل کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (۱۷/۳۹)

یہ حکمت کی ان باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا کہ ازواج رسولؐ کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں جو تلاوت کی جاتی ہیں انکو یاد رکھو۔

جس سے معلوم ہوا کہ حکمت قرآن میں شامل ہے ورنہ حدیثوں کی کون تلاوت کرتا ہے[1]

---

[1] اسی بنا پر حدیثوں کیلئے "وحی غیر متلو" کی اصطلاح وضع کی گئی تھی۔ یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ واضح رہے کہ وحی کی ان اقسام (متلو اور غیر متلو) کا کوئی سراغ عہد نبویؐ اور عہد صحابہ میں نہیں ملتا۔ یہ سب زمانہ ما بعد کی اختراعات ہیں۔ (طلوع اسلام)

Marfat.com

مگر امام صاحب نے اس کی طرف توجہ نہ فرمائی، حالانکہ خود ان کا قول ہے کہ حدیثیں منزل من اللہ نہیں ہیں بلکہ استنباطاتِ نبویہ ہیں، یعنی قرآنی آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھا اور فرمایا[1]۔ پھر جب حکمت کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ حدیث کیسے ہو سکتی ہے؟ قرآن میں ہے کہ "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی"۔ کیا لقمان کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں دی گئی تھیں؟

دوسری آیت "وما آتٰکم الرسول"، جو انھوں نے پیش کی اور ان کی تقلید میں آج تک علماء حدیث پیش کرتے چلے آتے ہیں، وہ مالِ فے (غنیمت بلا جنگ) کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں "اٰتا" کے لفظ کو جو "نھیٰ" کے بالمقابل واقع ہے، لوگوں نے غلط فہمی سے اَمَرَ یا قال کے معنی میں سمجھ لیا، حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا ہے، بلکہ ہر جگہ اس کے معنی "اعطا" یعنی "دینے" ہی کے ہیں، لہٰذا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔

تیسری دلیل بعض حضرات کی یہ ہے کہ سورۃ والنجم میں ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

رسول اپنے نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے

---

[1] اتقان جلد ۲ ص ۱۳۰

Marfat.com

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو نکلتا تھا، سب وحی تھا۔
لیکن یہ استدلال حقیقت فہمی سے بہت دور ہے کیونکہ یہاں ذکر ہے اس کلام کا جو بذریعہ وحی کے اترتا تھا اور جس سے کفار کو انکار تھا اور وہ صرف قرآن ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانگی امور میں ازواج مطہرات سے یا عام معاملات میں دوسرے لوگوں سے رات دن جو گفتگو فرماتے تھے، اس کے وحی ہونے کا نہ دعویٰ تھا، نہ اس کے متعلق کوئی بحث تھی، مخالفت صرف قرآن کی تھی اور وہی بذریعہ وحی کے نازل کیا گیا تھا، جس کی تصریح اس آیت میں ہے:

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ

اور میری طرف یہ قرآن اتارا گیا ہے کہ میں تم کو اس کے ذریعہ سے آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے

دوسری جگہ ہے:

قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْیِ (۲۱)

کہہ دے کہ میں تم کو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایۂ انذار صرف قرآن ہے اور وہی لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے وحی کیا گیا ہے۔ اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا اور لوگوں کو یاد کرایا۔
بعض لوگوں نے وحی کی دو قسمیں کر ڈالی ہیں۔ متلو اور غیر متلو، یا جلی اور خفی۔ ایک کو قرآن کہتے ہیں ایک کو حدیث، لیکن یہ ان کی محض خیالی اصطلاح

Marfat.com

ہے، جس کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں۔ حدیثیں بھی اگر وحی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن کی طرح لکھایا کیوں نہیں ؟

چوتھی دلیل جو بڑے شدومد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، یہ ہے کہ دسیوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسولؐ کا حکم دیا ہے۔ اگر حدیثیں دینی حجت نہ ہوں تو یہ اطاعت کس طرح ہوگی ؟ دراصل یہی سب سے بڑی غلط فہمی ہے جو حدیثوں کو دین بنانے کا موجب ہوتی ہے۔ میں نے اس بحث پر ایک مفصل مقالہ "اسلامی نظام" کے عنوان سے لکھ دیا ہے جو شائع ہو چکا ہے، اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں مختصراً صرف اس قدر لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں :

(۱) پیغمبری، یعنی پیغاماتِ الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ یہ پیغمبری آپ کی ذات پر ختم ہو گئی۔

(۲) امامت، یعنی امت کا انتظام، اس کو قرآن کے مطابق چلانا، اس کی شیرازہ بندی، ان کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر جہات اور جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

یہ امامت کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوعِ انسان کی صلاح و فلاح

Marfat.com

کے لئے قائم ہوئی، قیامت تک مستمر ہے، جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ رہنی چاہئے۔ قرآن میں اطاعتِ رسول کے جو احکام ہیں آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ منصب امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں۔ ان کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسولؐ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امامِ وقت یعنی مرکزِ ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُمت میں موجود تھے، ان کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت تھی (اور یہ اُمت ہمیشہ آپؐ ہی کی امت رہے گی، کیونکہ آپؐ کے اوپر ایمان لاتی ہے) اور آپؐ کے بعد آپؐ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت ہوگی اور اطاعت عربی میں کہتے ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو۔ رسولؐ کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہہ دے ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں۔ یہ ذہنیت اُمت میں اس وقت پیدا ہوئی جب کوئی صحیح خلیفہ رسولؐ نہیں رہا اور مستبدوں نے مرکز پر تغلب حاصل کر کے امت کو اپنا غلام بنالیا اور دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء اور رواۃ حدیث نے لے لی، اسی دن سے امت مذہبی انفرادیت اور انتشار میں مبتلا ہو گئی ورنہ دین کی ضروریات قرآن کے اتباع اور امامت وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ امام کیساتھ امت کے منتخب افراد ہونگے جن کی مشاورت سے وہ اسکو حسب اقتضائے زمانہ قرآن کے مطابق چلائیگا اور اسمیں وحدت مرکزی قائم رکھیگا اور متفرق نہ ہونے دیگا۔

Marfat.com

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو قرآن کا مخاطب قرار دیا ہے، وہ انسانی عقل ہے جس میں اس نے فکر و نظر کی قوت ودیعت فرمائی ہے۔ اس کی ہدایت کے لئے جس قدر روشنی کی ضرورت ہے اس کتاب میں رکھ دی ہے جو ہر زمان و مکان میں اس کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اور کسی ماحول کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی، بخلاف روایات کے جو ماضی کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہیں۔

قرآن نورِ مبین اور مفصل کتاب ہے جس کو اس کے اوّلین مخاطب یعنی صحابہ کرامؓ بے تکلف سمجھتے تھے۔ آنحضرتؐ کو اس کے الفاظ و معانی کی تشریح کی ضرورت بہت کم پیش آتی۔ کل زمانہ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہؓ نے جس قدر باتیں پوچھیں، وہ امام رازی کے بیان کے مطابق ۱۴، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں صرف ۱۲ ہیں۔ ان سب کے جوابات قرآن ہی میں نازل کئے گئے، جو علامہ سیوطیؒ کی اتقان میں نیز مختصر جامع بیان العلم کے آخری صفحہ میں ایک ایک کر کے گنا دیئے گئے ہیں بلکہ ہر شخص قرآن میں یسئلونك اور یستفتونك کے الفاظ سے خود بھی ان کو شمار کر سکتا ہے۔

قرآن و حدیث | اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی کو ایمانی کتاب قرار دیا ہے؛

Marfat.com

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

ایمان لایا رسول اس پر جو اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین بھی

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کو اسی کتاب پر ایمان رکھنے کی ہدایت کی ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا (۲/۳۵)

کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اتاری گئی

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (۴۲/۱۵)

اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں کتاب اللہ کے سوا کسی حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۔ (۳۱/۶)

اور بعض آدمی وہ ہیں جو "حدیث" کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بلا علم (یقین) کے بھٹکا دیں اور اس کو مذاق بنالیں۔ یہ ہیں جن کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

آیت میں "حدیث" کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں:

Marfat.com

(۱) اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

(۲) اس کی بنیاد علم یعنی یقین پر نہیں ہے۔

(۳) اس سے لوگ اللہ کی راہ یعنی دین کو مذاق بناتے ہیں۔

اس لئے جن لوگوں نے اس لفظ کی تفسیر غنا یعنی راگ کے ساتھ کی ہے، ان کا قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ راگ سے غرض نشاط و طرب ہوتی ہے نہ کہ گمراہ کرنا، یا اللہ کی راہ کو مذاق بنانا اور نہ اس کو علم یعنی یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص و روایات ہیں جو اس کے ذیل میں آتے ہیں۔

جس طرح قرآن ہی ایمانی کتاب ہے، اسی طرح وہی دستور العمل بھی ہے اور اسی کی پیروی کا حکم ہے:

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۱۰۶/۶)

پیروی کر اس کی جو تیری طرف تیرے رب کے پاس سے وحی کی گئی

اور رسول کو اس کے اعلان کر دینے کی ہدایت ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ (۲۰۳/۷)

کہہ دے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

اور امت کے لئے یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ (۳/۷)

Marfat.com

اس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف[1] تمہارے رب کے پاس سے اُتارا گیا

اور اس کے سوا اولیا کی پیروی نہ کرو

مرکز یعنی امام کو حکم دیا گیا کہ اسی کتاب کے ذریعہ سے لوگوں میں حکم رانی کرے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ( )

ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے

اور جو کوئی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ فاسق ہے:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۔)

(اور جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں)

قرآن ہی کی تبلیغ رسولؐ کا فریضہ قرار دی گئی:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ

لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (۵/۶۷)

(اے رسول جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو (لوگوں کو)

پہنچا دے اور اگر تو نے (یہ) نہ کیا تو اسکے پیغام کی تبلیغ نہیں کی

یہی قرآن سرمایۂ انذار ہے:

---

[1] یہ قرآن رسول کریمؐ کے توسط سے ساری امت کے لئے نازل ہوا ۔ انا انزلنا الیک الکتٰب للناس بالحق (۳۹/۴۱) (ہم نے تیرے اوپر کتاب انسانوں کے لئے نازل کی ہے حق کے ساتھ)

Marfat.com

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے تم کو

آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْیِ (۵)

کہہ دے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کرتا ہوں۔

الغرض یہی نورمبین، یعنی قرآن کریم ہے، جس کی روشنی میں نبی خود چلتا تھا اور سب کو چلاتا تھا۔ اسی آفتابِ حقیقت نے اس کے افقِ قلب پر طلوع ہو کر اس کو سراج منیر بنایا تھا۔ یہی اس کا سامانِ تعلیم و تبلیغ اور سرمایۂ بشارت و انذار تھا اور اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا، یعنی ان کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر اسلام اور ایمان کی روشنی میں لاتا تھا:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

عظیم الشان کتاب ہم نے تیری طرف اتاری ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے

اور اسی کے ذریعہ سے جملہ امور اور قضایا کے فیصلے کرتا تھا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ

Marfat.com

ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجھ کو سجھائے

اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرے۔

یہی کتاب سرتاسر یقینی ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲)

یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے

دین میں غیر یقینی چیزوں کی پیروی ممنوع قرار دے دی:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ

وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)

جس چیز کا تجھ کو یقین نہیں اس کے پیچھے نہ چل۔ کان، آنکھ اور

دل ہر ایک سے اس کی باز پرس ہوگی

اور ظنی امور کے متعلق فرمایا:

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳/۲۸)

ظن حق کی جگہ کام نہیں دیتا

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ

روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی بات ماننے لگا تو وہ

تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دینگے وہ تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں

Marfat.com

یہود نے اپنے احبار کی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے اعتماد پر وہ کہتے تھے کہ دوزخ ہم کو چند دنوں سے زیادہ نہیں جلا سکتا۔ قرآن نے کہا:

وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۲۴)

ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے ان باتوں نے جن کو وہ اپنے دین میں گھڑتے تھے۔

عقل اور حدیث

عقل کی رُو سے دیکھا جائے تو حدیثوں کی دینی حیثیت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بسلسلہ سند مروی ہیں۔ مثلاً میں نے سنا زید سے، اس نے عمر سے، اس نے بکر سے، اس نے خالد سے، اس نے اصغر سے، اس نے اکبر سے الخ ایسا بیان جو اتنے واسطوں سے آئے، نہ شہادت ہے نہ علم ہے اور سوائے ظن کے یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتا، کیونکہ اگر ایک شخص جس سے میں واقف ہوں، مجھ سے کوئی بات بیان کرے تو میں اس خیال کے مطابق جو اس شخص کی بابت میرے دل میں ہے، اس کی بات کے سچ یا جھوٹ ہونے کا فیصلہ اپنے قیاس سے کر سکتا ہوں، لیکن جب اس نے کہا کہ میں نے اس کو زید سے سُنا ہے تو میرے پاس کہ میں زید سے واقف نہیں ہوں، کوئی معیار اس کے جانچنے کا نہیں رہ گیا۔ اب خود اپنے اس اعتماد کے مطابق جو زید کے متعلق وہ رکھتا ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگا سکتا ہے اور جب اس نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمرو سے سنا تھا تو اب اس کے پاس بھی کوئی کسوٹی نہیں رہ گئی، اس لئے ایسے

Marfat.com

اقوال جو بہ سلسلہ سند مروی ہیں، قائل یا سامع کسی کے لئے بھی حجت نہیں ہوسکتے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بابت یہی کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں کے واسطہ سے یہ مروی ہیں، وہ معتبر لوگ تھے، لیکن یہ اعتقاد بھی میرا اور قائل کا نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد ان بیانات پر ہے، جو اس کے راویوں کے ہم عصروں کے ہیں، اس لئے یہ اعتماد ایک تاریخی چیز ہے۔ اس تاریخی بنیاد پر سولتے تاریخ کے دین کی تعمیر نہیں ہوسکتی، کیونکہ تاریخ ظن پر قائم ہوتی ہے، مگر دین یقین کا طالب ہے جو روایات ہیں بجز متواتر کے نایاب ہے اور متواتر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں، جن کے متعلق علمائے اصول کا اتفاق ہے کہ وہ صحیح ہونے کی صورت میں بھی یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اصول کی بہترین کتاب المستصفیٰ جلد اوّل صفحہ ۱۴۵ میں لکھتے ہیں:

خبر الواحد لا یفید العلم

خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی

خبر واحد سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی اسی صفحہ میں دیکھئے:

انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام مالا ینتھی
من الاخبار الی حد التواتر المفید للعلم فمانقلہ
جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فھو خبر الواحد

Marfat.com

اس مقام پر خبر واحد سے ہماری مُراد وہ حدیث ہے کہ حد تواتر تک جو
مفید یقین ہے نہ پہنچے ، مثلاً ایک حدیث جس کو کوئی جماعت پانچ
یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو خبرِ واحد ہے۔

پانچ یا چھ تو مثال کے طور پر کہا جاتا ہے جب تک کوئی روایت تواتر کی چاروں شرطیں جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں، پوری نہ کرتی ہو، خواہ وہ سینکڑوں راویوں سے کیوں نہ مروی ہو، غیر متواتر اور خبرِ واحد ہی رہے گی۔

حدیث کی بابت ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس کی تدوین کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا جبکہ بنی اُمیہ نے مسلمانوں کو غلام بنا لیا تھا۔ اس کے کُل مجموعے جو آج اُمّت کے ہاتھوں میں ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس سے قبل کا نہیں ہے، بلکہ صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھ کتابیں جو اہلِ سُنّت میں مقبول ہیں، تیسری صدی ہجری کی مرتّب کی ہوئی ہیں اور بنی اُمیہ کے عہد میں چونکہ خلفا نے دینی قیادت چھوڑ دی تھی اور وہ محدثوں اور راویانِ حدیث کے ہاتھوں میں آ گئی تھی، اس وجہ سے امت میں ان کی عظمت و شان قائم ہو گئی تھی، جس کو دیکھ کر ہزاروں دُنیا داروں نے روایت کو بطور پیشہ کے اختیار کر لیا تھا اور جمہور میں مقبول اور محترم ہو گئے تھے۔ ان میں سے مختلف طبقات نے اپنے اپنے اغراض سے وضعی حدیثیں بنائیں اور اُمت میں ان کو پھیلایا۔ بعد میں جو آئمہ حدیث ان کی تنقید کے لئے کھڑے ہوئے،

Marfat.com

ان کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا، جس سے کھری کھوٹی حدیثوں کو پرکھ کر الگ الگ کر سکتے۔ اس وجہ سے ان کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی مشتبہ رہیں۔ چنانچہ غیر مسلم معترضین اسلام پر جس قدر اعتراضات کرتے ہیں، ان میں سے اکثر کی بنیاد ان حدیثوں پر ہوتی ہے جن کو مسلمانوں نے صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے مگر اصل میں وہ موضوع ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے کہ حدیث کے معاملہ میں حسنِ ظن جائز نہیں ہے بلکہ ان کا جانچنا اور پرکھنا ضروری ہے، کیونکہ حدیث خبر ہے جس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے خود اس کی تنقید میں کوششیں کیں۔ اس سے بداہتہً ظاہر ہو جاتا ہے کہ حدیثیں علمی تنقید کے تحت میں ہیں اور ان کا درجہ دینی نہیں ہے، کیونکہ دینی امور یقینی اور تنقید سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اللہ نے رسولوں پر ایمان لانے کا اسی وجہ سے حکم دیا ہے کہ اس کے بعد ان کے لاتے ہوئے پیغامات میں شک نہ واقع ہو سکے۔ بخلاف اس کے راویانِ حدیث پر ایمان لانے کا کوئی حکم نہیں ہے، جو ان کی روایات کی تصدیق ضروری ہو۔ روایات تو کیا خود ہزاروں راوی ایسے ہیں کہ جن کو ایک اگر سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا کہتا ہے اور ہم کسی کی گرفت نہیں کر سکتے کیونکہ تنقید میں ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز میں آزاد ہے۔ اس وجہ سے روایات کی تنقید علمی ہے اور ان کا درجہ تاریخی ہے۔ وہ دینی حجت نہیں ہو سکتیں۔

Marfat.com

رُتبۂ حدیث گزشتہ ابواب پر نظر ڈالنے سے حسب ذیل امور نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں:

(۱) حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیز خلفائے راشدینؓ کی مرضی کے خلاف رواج پذیر ہوئیں، کیونکہ حضور اکرمؐ نے تاکید کی تھی کہ مجھ سے روایتیں کرنے سے بچو۔ اور خلفائے راشدین مسلسل کوشش کرتے رہے کہ اس کو یک قلم روک دیں — (۲) حدیثوں کی کتابت کا بھی یہی حال ہے! آنحضرتؐ نے تصریحاً ان کے لکھنے کی ممانعت فرمائی اور خلفائے راشدینؓ اور صحابۂ کرامؐ برابر اس کے نوشتوں کو مٹاتے اور جلاتے اور اُمت کو فتنۂ کتابت سے روکتے رہے — (۳) حدیثوں کی تصحیح و تضعیف بھی ظن و تخمین پر مبنی ہے، کیونکہ ائمہ جرح و تعدیل کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات کے اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے صحیح اور ضعیف روایات میں یقینی امتیاز قائم کر سکتے، اس لئے ان کی صحیح قرار داد کی حدیثیں بھی ظنّی ہیں۔ ان کے اصول کے مطابق کسی روایت کو صحیح کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "گمان غالب یہ ہی کہ آنحضرتؐ نے ایسا ہی فرمایا ہوگا" نہ کہ قطعی یقین، جیسا کہ مُلا علی قاری نے اپنی کتاب موضوعات میں تصریح کی ہے:

> یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ عقل جائز

Marfat.com

دکھتی ہے کہ جن کو انھوں نے صحیح کہا ہے، وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

پھر یہ صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی بالمعنی روایت کی گئی ہیں، جس کی وجہ سے ان میں بیحد اختلافات ہیں۔ ان کو دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں سینکڑوں فرقے بن گئے ہیں اور ملت کا شیرازہ بکھر گیا ہے سُنّیوں کی حدیثیں الگ ہیں اور شیعوں کی الگ۔ ہر ایک فرقے نے اپنے مذہب کی تعمیر اپنے حسبِ منشا۔ روایات سے کی ہے وہ صرف اپنی ہی حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسروں کی حدیثوں کو غلط۔ اور فرقہ بندی قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ الآیہ

اور مشرکین میں سے نہ ہو، یعنی ان میں سے جنھوں نے اپنے دین میں تفریق ڈال دی ؛

بیشک آیاتِ قرآن کے معانی سمجھنے میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں مگر یہ اختلافات چونکہ الفاظ و عبارات کے نہ ہوں گے بلکہ صرف فہم کے ہوں گے اس لئے مزید غور و فکر سے مٹ جائیں گے اور ان سے فرقہ بندی نہ ہو سکے گی۔

الغرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے۔ اس سے تاریخی فائدے

Marfat.com

حاصل کئے جا سکتے ہیں، لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ نہیں پیش کی جا سکتی۔ اس کو دین بنا لینے سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ قرآن کریم جو سراسر زندگی ہے حجاب میں آگیا ہے چنانچہ محدثین میں شروع سے لے کر آج تک جو اہم اور معرکۃ الآرا امور زیر بحث رہے ہیں، بالعموم اس قسم کے ہیں، جن کا ملت کی صلاح و فلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی عملی تعلق نہیں ہے، مثلاً حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں یا حضرت علیؓ؟ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سماءِ دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے؟ قیام نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہیئے یا نہیں؟ کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے؟ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ وغیرہ وغیرہ ــــ بخلاف اس کے اگر قرآن پر مدار رہتا تو اس نوعیت کے مسائل پیش نظر رہتے کہ مرکز کو قوی اور صالح العمل کیونکر رکھا جائے؟ قرآنی ہدایت کو عام کرنے اور جملہ انسانی برادری کو اس نجات اور سعادت کے راستے پر لانے کے کیا وسائل ہیں؟ کائناتِ فطرت جن کی نسبت قرآن نے کہا ہے کہ انسان کے لئے مسخر کئے گئے ہیں، ان کی مخفی قوتوں کو کن تدابیر سے قابو میں لا کر انسانی خدمت میں لگایا جا سکتا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کو کن ذرائع سے ایسا فروغ دیا جائے کہ ملت کا ہر فرد صحیح "خلیفہ فی الارض" ہو سکے جس کے لئے اس کی تکوین ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

حقیقتِ حدیث

(علامہ حافظ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

قرآنِ کریم پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم جس رسول امین پر اُترا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم جس روح الامین کے توسط سے اتارا گیا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور قرآن کریم کو جس معبود نے اتارا، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ نہ حدیث کے راوی پر ہمارا ایمان ہے، نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں، ان پر ہمارا ایمان ہے، نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں۔

حدیث کی صورت یہ ہے کہ زید نے کہا میں نے سنا عمرو سے، اُس نے سُنا بکر سے، اس سے بیان کیا تھا خالد نے، اس سے کہا تھا اصغر نے، اُس نے سُنا تھا اکبر سے الخ۔ ایسا بیان روایت در روایت در روایت نہ علم ہے نہ شہادت

Marfat.com

اور نہ دنیا کی کسی عدالت کے نزدیک قابلِ سماعت ہے۔ پھر یہ حجت کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں ایک بات حدیث میں ہے، وہ یہ کہ اس کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا جاتا ہے اور یہی چیز ہے جس کی بدولت اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں، لاکھوں حدیثیں راویوں نے اپنے اپنے خیالات اور اغراض کے ماتحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں وضع اور کذب سے کام لیا ہے تو اس نسبت کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ اگر یہ ہوتا کہ ہر ایک روایت کے آخری راوی سے ثبوت طلب کیا جاتا کہ تم نے جو فلاں سے اس کو سنا ہے، اس کے دو گواہ عادل پیش کرو جو شہادت دیں کہ ہمارے سامنے اس نے یہ روایت کی پھر اسی طرح سلسلہ کے ہر ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ آخر تک ہوتے تو بھی روایت کا کچھ اعتماد قائم ہوتا، مگر یہاں تو نہ کوئی ثبوت ہے نہ شہادت ہے۔ ہر راوی جو کچھ بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے اور خود ہی گواہ ہے اور خود ہی ثبوت ہے[1]۔ یعنی کسی بات کو آنحضرت صلعم کی طرف بسلسلۂ روایت در روایت منسوب کر دینا اسی کا نام حدیث ہے، لہٰذا جملہ روایات کسی قسم کے ثبوت سے عاری ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جو رواۃ ہیں وہ معتبر ہیں لیکن یہ اعتبار

---

[1] اگر کوئی روایت متعدد طرق سے مروی ہے تو ہر ایک طریق بالکل اسی طرح بے دلیل ہے اور ثبوت کا محتاج۔

Marfat.com

کس بنیاد پر قائم ہوا ہے؟ صرف ان کے ہم عصروں کے بیانات پر۔ یہ بیانات خود حجت نہیں، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں باہم دگر سخت اختلافات ہیں اور ہزاروں ہیں، جن کو اگر ایک سچا سمجھتا ہے تو دوسرا جھوٹا۔ ائمہ نے رواۃ کی جو توثیق کی ہے وہ صرف عرفِ عام کے مطابق ہے نہ کہ حقیقت کے۔ ایسی ظنی اور تخمینی ثقاہت تاریخ میں تو کچھ کارآمد ہو سکتی ہے لیکن دین میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا دارومدار علم و یقین ہے۔ قرآن میں تصریح ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل آیہ ۳۶)

اس کے پیچھے نہ چل، جس کا تجھ کو یقین نہیں ہے

حدیثیں دین کیونکر بنیں؟

قرآن کریم اسلام کی مستقل اور کامل کتاب ہے جس میں اللہ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے اور جس کی حفاظت ہمیشہ کے لئے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہی کتاب عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ میں ملتِ اسلامیہ کا دستور العمل رہی، لیکن جب بنی اُمیّہ کا زمانہ آیا تو وہ حکومتِ الٰہیہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھی، انسانی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ ان نام نہاد خلفا نے (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے) اپنا ذاتی تسلط ملت پر جما یا اور خزانہ اور ملک پر قبضہ کر کے فوج کو اپنے قابو میں کیا اور اس کی قوت سے آزاد مسلمانوں کو جو صرف اکیلے اللہ کے محکوم اور مطیع تھے، اپنی رعایا اور غلام بنا لیا اور ان کی دینی قیادت اور راہنمائی جو

Marfat.com

خلیفۂ اسلام کا اوّلین فریضہ تھی، علما کے ذمّہ چھوڑ دی۔ اس وقت سے سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہوگئیں۔ سیاست کا مرکز تو بہی خلفا رہے اور دین لامرکزی صورت میں علما کے ہاتھ میں آگیا۔ ان کے اجتہادات اور استنباطات میں اختلافات کا پڑنا لازمی تھا، جن کے فیصلے کے لئے کوئی مرکز نہ تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مرکز بنائی گئی اور ہر مسئلہ اور ہر اجتہاد کے لئے روایت کا سلسلہ نکالا گیا۔ بنی اُمیّہ کے عہد میں چونکہ عربی زندگی تھی، اس وجہ سے روایات کا ذخیرہ زیادہ نہیں ہوا، لیکن بنی عباس کے زمانے میں جب مختلف علوم و فنون کے ترجمے کئے گئے اور متعدد عجمی اقوام سے اختلاط ہوا اور خیالات، افکار اور دینی مسائل میں بہت وسعت پیدا ہوگئی، اس وقت روایت نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کرلی اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے یہی پیشہ اختیار کرلیا اور چونکہ روایت کشی کے لئے کسی لیاقت یا معیارِ علم کی شرط نہیں تھی، اس لئے ہر شخص جس میں ذرا بھی تدین ہوتا، اس میں حصہ لے کر دینی عزت اور دنیاوی بزرگی حاصل کرنے لگا اور روایت ایک عام مشغلہ ہوگئی اور ہر شہر میں رواۃ کی تعداد کی کوئی حد نہ رہی۔

قرآن کو خلفائے بنی اُمیہ (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ) اور خلفائے بنی عباس نے جو دراصل مستبد سلاطین تھے، سیاست سے پہلے ہی متروک کر دیا تھا۔ اب ان راویوں نے دینی حیثیت سے روایتوں کے اندر اس کو دفن کر دیا

Marfat.com

اور اس کی تشریح و تفسیر بھی انھیں سے ہونے لگی اور حدیث کا تسلط اس قدر بڑھ گیا کہ امام اوزاعی متوفی ۱۵۷ھ نے فرمایا کہ "قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں۔" اور امام یحییٰ بن کثیر نے کہا کہ "حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے"[۱]۔

حدیثوں کے ذریعہ سے قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام، مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید، بلکہ اس پر اضافے کرنے لگے۔ نیز بعض ائمہ فقہ نے روایات سے آیات کو اصولاً منسوخ کرنے کا فتویٰ دے دیا اور اس طرح قرآن کے استقلال کو مٹا کر اس کو حدیثوں کے ماتحت بنا دیا، جن کی بدولت دین میں سینکڑوں باتیں ایسی داخل ہو گئیں، جن کا قرآن میں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

موضوعات حدیث نے جب فن کی صورت اختیار کر لی اور روایات دین قرار پا گئیں تو ان میں وضع اور کذب نے راہ پائی اور ہزاروں پیشہ ور کذّاب پیدا ہو گئے جن کا رات دن یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں۔ ائمہ حدیث نے جب تنقید کی طرف توجہ کی تو ان کو موضوعات کا ایک انبار ملا۔ ملا علی قاری نے اپنی کتاب "موضوعاتِ کبیر" میں لکھا ہے کہ "زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں"۔ شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب "تذکرۃ الموضوعات" میں لکھتے ہیں کہ جوئباری، ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار حدیثیں

---

[۱] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۲۳ مطبوعہ مصر

Marfat.com

بنائیں۔ ابن ابی العوجاء زندیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتا رہا ہوں۔ وضاعین کی سب سے پہلی فہرست امام ابو عبداللہ برقی متوفی ۲۴۹ھ نے تیار کی۔ اس کے بعد دیگر ائمہ جرح و تعدیل نے اس میں کتابیں لکھیں، جن میں سے چند یہ ہیں:-

کتاب الضعفاء[1]	امام بخاریؒ متوفی ۲۵۶ھ
"	ابو اسحٰق جوزجانی متوفی ۲۵۹ھ
"	ابو جعفر عقیلی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابو نعیم استرآبادی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ (یہ کتاب کامل

کے نام سے مشہور ہے اور بارہ جلدوں میں ہے)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپ کے نام سے روایت کی گئی ہیں، ان کا ۹۹ فی صدی حصہ مدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کی مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین کی اتنی بڑی جماعت ہو گئی جن کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے جانے لگے اور صدیوں کا زمانہ ان کو مل گیا، جس میں ان کے اوپر نہ کوئی پابندی تھی، نہ کسی

---

[1] ضعفار کا لفظ [illegible] سے ازراہِ [illegible] اختیار کیا ہے کہ شاید ان میں کوئی سچا ہو، ورنہ مراد کذابین ہیں۔

Marfat.com

قسم کی گرفت، بلکہ عوام میں مقبولیت، شہرت، عظمت اور بزرگی حاصل ہوتی تھی۔ پھر انھوں نے جس قدر حدیثیں وضع کی ہوں گی، ان کو سوائے علام الغیوب کے کون شمار کرسکتا ہے؟

ائمہ حدیث نے وضع حدیث کے مختلف اغراض اور اسباب بھی بیان کئے ہیں مثلاً۔

۱۔ بنی امیہ کے عہد میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منبروں سے لعنت بھیجنے کا دستور نکالا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں امیر معاویہؓ کے مناقب اور حضرت علیؓ کے مثالب میں حدثیں بنائی گئیں۔ اسی عہد میں روایتوں کے ذریعہ سے ایمانیات میں "تقدیر" کا اضافہ کیا گیا۔ قرآن میں تو ایمان کے صرف پانچ اجزا بتلائے گئے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲/۱۷۷)

لیکن نیکی (کرنے والا) وہ ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخر پر اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور انبیاء پر

دوسری آیت میں ہے؛

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۴/۱۳۶)

Marfat.com

اور جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں
اور یوم آخر کا انکار کیا وہ دور کی گمراہی میں پڑ گیا۔

لیکن اس میں چھٹا جزء "اَلقَدَرُ خیرہ و شرہ کلہ من اللہ" بھی بڑھایا گیا جو آج تک بدستور چلا جاتا ہے، حالانکہ قرآن نے تقدیر کو دین کی ایک حقیقت بتایا ہے، اس کو ایمانیات میں نہیں داخل کیا ہے۔

۲۔ ردِ عمل کے طور پر بنی عبّاس کے دعاۃ نے ہزاروں حدیثیں بنی اُمیّہ کے معائب اور اقربا رسول کے فضائل و استحقاقِ خلافت میں بنا کر مغرب سے مشرق تک پھیلا دیں۔

۳۔ تختِ خلافت پر آجانے کے بعد عبّاسیوں نے اپنی حکومت کو دینی رنگ دینا چاہا، اس وجہ سے ان کے ایک ایک خلیفہ کی پیشین گوئی اور فضیلت میں روایات بنائی گئیں۔ ابو الفرج اصفہانی مطیع بن ایاس کے حالات میں لکھتا ہے کہ خلیفہ مہدی اس کا بڑا قدردان تھا، کیونکہ وہ اس کی مہدویت کے بارے میں حدیثیں بنایا کرتا تھا[1]۔

۴۔ اہل بیت کے خلافت سے محروم ہوجانے کے بعد شیعہ انکی امامت نیز ان میں سے ایک مہدی کے آنے کی بشارت کی روایتیں اُمّت کو سناتے تھے اور اپنے ائمہ کی عصمت و عظمت اور ان کی محبّت اور وِلا کو جزوِ ایمان

---

[1] زنات المثالث والمثانی فی روایات الآغانی جلد ۱۔ ص ۲۹۷۔

Marfat.com

اور نجات کا ذریعہ ثابت کرنے کے لئے حدیثیں تراشتے تھے[۱]۔ اور یہ سب کچھ محض ان کی نسبی خصوصیات کی بنا پر تھا، حالانکہ قرآن کی رو سے انسان کی فضیلت کا معیار اس کے عقائد و اعمال ہیں۔ نسب کی بنیاد پر کسی کو کوئی حق وہ نہیں دیتا بلکہ اس کو صرف تعارف کا ذریعہ اور جیتے جی کا رشتہ بتلاتا ہے:

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ (۲۳/۱۰۱)

پھر جب صور پھونک دیا گیا تو نہ اس دن ان میں رشتے ہوں گے اور نہ آپس میں پوچھ گچھ کریں گے۔

اور قیامت کے دن مطلق کارآمد نہیں۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۶۰/۳)

ہرگز تم کو نفع نہیں پہنچائیں گے تمہارے رشتے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن

۵۔ قصاص، مذکر اور واعظ طرح طرح کے قصے، افسانے اور روایتیں آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کر کے اپنے قصص، اذکار اور مواعظ کو دلچسپ اور باثر بناتے تھے۔

۶۔ زندیقوں یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر

---

[۱] شیعہ کے نزدیک ہر وہ بات جو ان کے کسی امام معصوم کی طرف منسوب ہو، حدیث ہے۔ اس لئے ان کے یہاں روایات بہت ... ہو گئی اور اسی نسبت سے موضوع روایات کی کثرت

Marfat.com

دربردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے، ایسی ایسی حدیثیں گھڑیں جو شریعت کو فنا کر دینے والی تھیں۔

۷۔ مختلف فرقے جو اسلام میں پیدا ہو گئے تھے، ان میں سے اکثر اپنی تائید اور اپنے مخالفوں کی تردید میں حدیثیں گھڑتے تھے۔

۸۔ بعض لوگ جو متدین اور محترم سمجھے جاتے تھے، اعمال و اذکار کی ترغیب و ترہیب میں روایتیں وضع کرتے تھے، چنانچہ نوح بن مریم نے قرآن کی ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔ جب لوگوں نے تحقیق کی اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے بے تکلف اقرار کر لیا کہ یہ روایتیں میں نے بنائی ہیں" تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلتیں اور بمقابلہ دیگر انبیاء کے جو خصوصیتیں ہیں، ان کو قرآن نے مفصل بیان کر دیا ہے یعنی:

(۱) دیگر انبیاء قبائلی یا قومی ہوتے تھے مگر آپ جملہ بنی نوع انسان کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے۔

(۲) انبیاء سابقین کے اوپر جو کتابیں یا صحیفے نازل کئے گئے وہ سب فنا ہو گئے۔ آج توریت، زبور اور انجیل کے بھی صرف ترجمے ہیں اور اصل مرفوع۔ لیکن آپ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی، اس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

Marfat.com

(۳) آپ کے اوپر نبوت ختم کر دی گئی اور قیامت تک کے لئے یہی نبوت قائم رکھی گئی۔

(۴) معراج میں انسانی کمال کی آخری حد اور علوم نبوت کے اُفقِ اعلیٰ پر پہنچا کر آپ کو اللہ نے جملہ انبیاء کی وراثت اور نبوتِ کُبریٰ سے سرفراز فرمایا۔

ان کے علاوہ بھی جا بجا آیات میں آپ کے صفات اور فضائل کا ذکر ہے اور قرآن نے ان کے بیان کرنے میں کمی نہیں کی ہے، مگر باوجود ان کے رسول پرستی کے جذبہ میں آپ کے مدائح اور صفات میں ہزارہا روایتیں گھڑی گئیں، جن میں سے خود محدّثین نے بیشتر کو موضوع قرار دیا۔

یہی حال معجزات کا ہے۔ قرآن نے تصریح کے ساتھ کہا کہ خاتم النبییّن کو عقلی معجزہ قرآن کریم دیا گیا جس کو اہلِ بصیرت قیامت تک دیکھ سکتے ہیں، نہ کہ دیگر انبیاء کی طرح حِسّی معجزہ[1]۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ط قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ط هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (۷/۲۰۳)

اور جب تو ان کے پاس کوئی نشان نہیں لایا تو انھوں نے کہا کہ کیوں نہ تو نے کوئی نشانی چُن لی۔ کہہ دے کہ میں تو اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے

---

[1] ان باتوں کی تفصیل ہماری کتاب تعلیماتِ قرآن میں ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

رب کے یہاں سے وحی مجھ پر آتی ہے۔ یہی تمہارے رب کی طرف سے
بصیرتیں ہیں۔

یہی بات دوسری آیت میں مزید تصریح کے ساتھ ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹: ۵۰-۵۱)

اور کافروں نے کہا کہ کیوں نہ اس کے اوپر کوئی نشانی اتاری گئی۔ کہدے
کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں، میں تو کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں کیا
ان کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم نے تیرے اوپر کتاب اتار دی ہے جو ان
کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

یعنی جس نشانی یا معجزہ کے وہ طلبگار ہیں، اگر ان کے پاس بصیرت ہو تو اس کے لئے قرآن کافی ہے۔

آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ کوئی نشانی جیسی کہ یہ منکرین طلب کرتے ہیں مل جاتی، تو میں ان کو قائل کر کے مسلمان بنا لیتا۔ اس پر سورۃ انعام میں اللہ تعالیٰ کسی قدر عتاب کے ساتھ فرماتا ہے:

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ

Marfat.com

فَتَاْتِیَہُمْ بِاٰیَۃٍ ؕ وَلَوْشَآءَ اللّٰہُ لَجَمَعَہُمْ عَلَی الْھُدٰی
فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ (۳۵/۶)

اگر تیرے اوپر ان کی رُوگردانی گراں گذرتی ہے تو اگر تجھ سے ہوسکے تو
زمین میں کوئی سوراخ تلاش کر یا آسمان پر سیڑھی لگا اور ان کے لئے نشانی لا۔
اللہ اگر چاہتا تو سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا تو جاہلوں میں سے نہ بن۔

اور سورۃ بنی اسرائیل میں حسی معجزات نہ دینے کی وجہ بھی بیان کر دی۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ
بِھَا الْاَوَّلُوْنَ (۱۷/۵۹)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے
لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں

گذشتہ قوموں نے معجزات طلب کئے۔ پھر ان کو دیکھ لینے کے بعد جادو اور نظر بندی وغیرہ کہہ کر جھٹلایا، اس لئے اتمام حجت کے بعد ان کا ہلاک کرنا لازم آگیا، لیکن رحمۃ للعالمین کا دور عقل و بصیرت کا دور ہے، جس میں انسان کو خود حقیقت کو سمجھ کر ایمان لانا چاہئے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (۲۹)

اور کہہ دے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر بنے

مگر ان صریح آیات کے ہوتے ہوئے بھی راویوں نے آنحضرتؐ کے حسی معجزات

Marfat.com

کی روایات کا انبار لگا دیا[۱]۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے اُمّت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اولیاء کی کرامات پر بھی ایمان رکھو۔

۱۰۔ مناقب صحابہ میں جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر کو محدّثوں نے موضوعات کی فہرست میں داخل کیا ہے۔

دراصل صحابہ کرام کی فضیلت کے لئے وہی آیتیں دینی لحاظ سے کافی ہیں جو مہاجرین وانصار کی مدح میں قرآن میں ہیں اور تاریخی لحاظ سے ان کے کارنامے ان کی عظمت کے شاہد ہیں۔ ان کی برتری اور بزرگی کیلئے روایات کی ضرورت ہی نہیں۔

۱۱۔ علماء اور متعلّمین کے فضائل میں جس قدر روایتیں ہیں، خود ساختہ ہیں۔

۱۲۔ شخصیت پرستی آجانے کی وجہ سے اشخاص نیز مقامات کی فضیلتوں میں حدیثیں وضع کی گئیں۔

۱۳۔ تصوّف جب مسلمانوں میں آیا تو بہت سی متصوفانہ روایتیں بنائی گئیں، جو موضوعات جمع کرنے والے محدّثوں کے حصّہ میں آئیں۔

۱۴۔ آنحضرتؐ کے غزوات، پیش گوئیوں نیز آیات کی تفسیر میں ہزاروں

---

[۱] ان روایات کے مطالعہ کا جس کو شوق ہو، وہ مولانا کرامت علی موسوی دہلوی کی تالیف "السیرۃ المحمدیہ" کی جس میں عجیب وغریب ہزارہا معجزات جمع کئے گئے ہیں زیارت فرمائیں۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے مدت ہوئی بمبئی میں بڑی تقطیع پر باریک خط میں ساڑھے چھ سو صفحات پر طبع ہوئی تھی۔

Marfat.com

نہیں بلکہ لاکھوں حدیثیں روایت کی گئیں، جن کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ان کی کوئی اصلیت نہیں[1]۔

الغرض اور کذب کے بہت سے اسباب تھے اور بہت سی راہیں۔ ہر ہر شعبہ میں بے شمار روایتیں گھڑی گئیں اور ایک ایک سچ میں سو سو جھوٹ ملایا گیا۔ لاریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال کے متعلق کچھ صحیح حدیثیں بھی ضرور تھیں لیکن اس جھوٹ کے سیلاب سے جو مختلف راستوں سے آیا، سچائی کے ان قطروں کو یقین کے ساتھ چن لینا انسانوں کے لئے بالکل ناممکن ہو گیا۔ کیا کذب اور وضع سے بڑھ کر دینِ الٰہی کو مذاق بنانے کی اور کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ قرآن میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا۔ (۳۱/۶)

اور بعض لوگ وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ بلا یقین کے اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کریں اور اس (اللہ کی راہ) کو مذاق بنائیں۔

دو قسم کے شیاطین ہر نبی کی عداوت کے لئے دو قسم کے شیاطین (کذابین) ہوتے ہیں جن کی تفصیل قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۲

۱۔ پہلی قسم وہ ہے جو نبی کے اوپر اتری ہوئی آیات میں اضافے کر کے ان کو مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اِن اضافوں سے اپنی آیات کو محفوظ کر کے محکم کر دینے کا ذمّہ اللہ نے خود لیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ (۲۲/۵۲)

ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ جس وقت اس نے تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں (اپنے الفاظ) ڈال دیئے پھر اللہ شیطان کی ڈالی ہوئی باتوں کو نکال کر اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اس لئے "تلک الغرانیق" اور اسی قسم کی قرآت شاذہ کی روایتیں جن سے اللہ نے اپنی آیات کو پاک کر کے محکم کر دیا ہے، نا قابلِ قبول بلکہ نا قابلِ سماعت ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جو دین میں جھوٹی روایتیں گھڑتی ہے اور افترا کرتے ہوئے نہ عاقبت سے ڈرتی ہے نہ اللہ سے شرماتی ہے۔ مفتریوں کی سزا نامرادی ہے "وقد خاب من افتریٰ"۔ یہودیوں نے جھوٹی روایتیں گھڑی تھیں۔ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا:

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۳/۲۴)

اور دین میں ان کو دھوکا دیا ان باتوں نے جن کو وہ گھڑتے تھے

Marfat.com

محدّثین کی اس جماعت کو چھوڑ کر جنھوں نے سچّائی کی جستجو کی، وضّاعین اور کذابین ان آیات کے تحت میں آتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـــِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۱۱۲ تا ۱۱۶)

اور ایسا ہی ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے، انسی اور جنّی شیاطین جو ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب دینے والی باتیں سکھاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے سو تُو ان کو اور ان کی گھڑی ہوئی باتوں کو چھوڑ دے

Marfat.com

اور وہ اس لئے (کرتے ہیں)، تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اس کو پسند کریں اور وہی کریں جو وہ کر رہے ہیں۔ (تو یہی کہتا رہ) کہ کیا اللہ کے سوا میں اور کسی کو منصف مانوں، حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصّل کتاب اتار دی ہے اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتری ہے۔ لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور تیرے رب کی باتیں سچائی اور عدل کی رو سے پوری ہیں، کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں ہے، وہ سمیع و علیم ہے اور اگر تو بات مانے گا اکثر لوگوں کی جو دنیا میں ہیں تو وہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، وہ تو صرف گمان پر چلتے ہیں اور محض اٹکل دوڑاتے ہیں۔

ان آیات کی تشریح کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے مگر چند باتیں بالکل واضح ہیں:

۱۔ ہر نبی کے دین میں وضاعین اور کذابین روایتیں گھڑتے اور پھیلاتے ہیں۔

۲۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ ان ہی جیسے عقبیٰ سے بے خوف لوگ ان کی باتیں مانیں اور وہی کرنے لگیں جو وہ کر رہے ہیں۔

۳۔ مؤمن کو حکم ہے کہ ان کو اور ان کی گھڑی ہوتی روایتوں کو بھی چھوڑ دے اور یہی کہے کہ اللہ کے سوا میں کسی کو حکم نہیں مانتا۔ اس نے مفصّل کتاب

Marfat.com

اتار دی ہے (جو کافی ہے)

۴۔ اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت میں گمراہی کا ڈر ہے، کیونکہ اکثر لوگ ظنی اور تخمینی باتوں کو دین بناتے ہوتے ہیں۔

یہ اللہ کی اطاعت، رسول اور اس کے بعد اس کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگی جو اُمت کو قرآن کے مطابق چلائیں گے۔ یہ نہیں کہ ظنی روایات کے انبار میں سے ہر ہر فرقہ اپنے اپنے خیال کے مطابق صحیح حدیثیں چُن چُن کر ان پر عمل کرے اور رسول کی اطاعت کا دم بھرے۔

رفتارِ حدیث

عہدِ صحابہ میں حدیثیں بہت کم تھیں۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم روایت اور کتابتِ حدیث دونوں سے منع فرماتے تھے۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا حدیثیں بڑھتی گئیں اور چونکہ ان میں وضع اور کذب نے راہ پائی تھی، اس وجہ سے اربابِ بصیرت اور اہلِ تقویٰ ان کے قبول کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔

امام اعظم رح

ائمہ فقہ میں سب سے پہلے امام جن کی امامت آج تک مسلّم چلی آتی ہے، ابو حنیفہ رح متوفی ۱۵۰ھ ہیں۔ انھوں نے حدیثوں کی قبولیت کے لئے بہت سخت شرطیں رکھی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ راوی فقیہ ہو، تاکہ روایت کا موقع، محل، غرض اور مفہوم سمجھنے میں غلطی نہ کرے، اس وجہ سے وہ اخبار احاد میں سے ایسی روایتوں کو بھی جو

Marfat.com

قیاس صحیح کے خلاف معلوم ہوتیں، قبول نہیں کرتے تھے۔ مثلاً قرعہ اندازی کو وہ اصولاً قمار بازی خیال کرتے تھے پھر اس حدیث کو کیسے صحیح تسلیم کر لیتے کہ "آنحضرتؐ جب کسی سفر میں جاتے تو ازواج مطہرات میں قرعہ ڈلتے، جس کا نام نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے۔" اسی طرح ان کے نزدیک مالِ غنیمت میں سے سوار کا حصّہ پیادہ سے دُگنا تھا۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "گھوڑے کے دو حصّے ہیں اور سپاہی کا ایک۔" یعنی سوار کے تین حصّے ہیں۔ جواب دیا "میں ایک چوپایہ کا حصّہ ایک مؤمن سے ہرگز زیادہ نہیں سمجھتا۔" ان کا قول تھا کہ بیع جب پختہ ہو چکی تو فسخ کا اختیار بائع یا مشتری میں سے کسی ایک کو باقی نہیں رہا۔ کسی نے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری ایک دوسرے سے جُدا نہ ہو جائیں فسخ بیع کا اختیار باقی ہے۔ کہنے لگے کہ خواہ وہ دونوں ایک ہی جہاز میں ہوں یا ایک ہی قید خانے میں ہوں یا ایک ہی ساتھ سفر کر رہے ہوں؟ یعنی ایسی صورت میں مفارقت تو ہوگی نہیں، پھر بیع بھی پختہ نہ ہو سکے گی۔ وہ قصاص میں (غالباً مثلہ کے قیاس پر) غیر فطری اور بے رحمی کے طریقے کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں میں کچل دیا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سر بھی دو پتھروں میں کچلوا دیا۔ بولے کہ یہ ہذیان ہے۔ ایک بار ایک شخص نے کوئی سوال کیا، انھوں نے جواب دیدیا۔ اس نے کہا کہ آنحضرتؐ

Marfat.com

سے فلاں روایت اس کے خلاف ہے۔ کہا ہم کو ایسی روایتوں سے معاف رکھو۔
ابواسحٰق فرازی نے ان کے سامنے ایک حدیث بیان کی، بولے یہ حدیث خرافہ ہے۔
لوگوں نے اسی طرح کے کم وبیش دوسو فتاوے ان کے، حدیث کے خلاف گنائے
ہیں، اسی وجہ سے اربابِ روایت ان سے خفا ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے
بعض الناس کہہ کر ان کو ضعفاء میں شمار کیا ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہا کہ
ہم نے اللہ کے مقابلے میں ابوحنیفہؒ سے زیادہ جرأت کرنے والا نہیں دیکھا لیکن
حقیقت یہ نہیں ہے۔ وہ دراصل ان روایات کی نسبت کو رسول اللہؐ کی طرف
صحیح نہیں سمجھتے تھے اور انھوں نے جو دقیق شرطیں حدیث کی صحت کے لئے رکھی تھیں۔
ان کے مطابق وہ نہیں اترتی تھیں۔ امام شافعیؒ نے "کتاب الام" میں ان کے
شاگرد رشید امام ابویوسفؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "جو روایت قرآن کے خلاف
پڑتی ہو، وہ رسولؐ کا فرمان ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا قرآن اور سنّت (اسوۂ
رسول) کو معیار سمجھ کر انھیں پر روایتوں کو جانچا کرو۔" مکی نے بھی "مناقب
ابوحنیفہ" صد ۹۹ میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ "روایت کا ردّ نبی صلی اللہ علیہ
وسلم کی تکذیب نہیں ہے بلکہ اس کی تکذیب ہے جو غلط بات کو آنحضرتؐ
کی طرف منسوب کرتا ہے، ورنہ آپ کا فرمان سر اور آنکھوں پر، اس پر
ہمارا ایمان ہے اور یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ آپ نے کوئی حکم ایسا نہیں دیا
جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو اور نہ کوئی بدعت یعنی نئی بات اپنی طرف

Marfat.com

سے کہی۔[1]

مؤطّا امام اعظمؒ کے بعد ہی امام مالک کا زمانہ ہے بلکہ ان دونوں اماموں کو ہم عصر سمجھنا چاہئے۔ امام ابو حنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پا گئے اور امام مالکؒ کی پیدائش ۹۳ھ میں ہوئی۔ ان کی کتاب مؤطّا خیر القرون کے عمل متواتر کا دینی کتابوں سے زیادہ اعتماد کے قابل مجموعہ ہے کیونکہ مدینہ منورہ عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ میں اسلام کا مرکز رہا۔ اس میں علمائے تاریخ کے اندازہ کے مطابق کم وبیش بارہ ہزار صحابہ تھے، جن میں سے تقریباً دس ہزار وہیں رہے اور وہیں فوت ہوئے بقیہ دو ہزار دیار و امصار یعنی عراق و مصر و شام و یمن وغیرہ میں پھیلے۔ اس لئے شریعت کا اصلی اور صحیح ذخیرہ مدینہ ہی میں ہو سکتا تھا۔ یہ خوبیٔ اتفاق ہے کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جس قدر دینی کتابیں ہیں، ان میں سب سے پہلی کتاب جو مدوّن ہوئی وہ مدینہ میں ہوئی، یعنی یہی مؤطّا۔ اس کتاب میں اہلِ مدینہ کے پاس اسوۂ رسولؐ و خلفائے راشدین وصحابہ کرام و تابعین عظام کا جو کچھ سرمایہ تھا اور جس قدر مسائل اور فتاوے

---

[1] ضحی الاسلام جلد ۲ صفحہ ۱۹۳ - ۱۹۵۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امام اعظمؒ کی مثال کو میں نے عدمِ حجیتِ حدیث کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، غالباً وہ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق حجت مانتے تھے۔ میرا استدلال تو قرآن کریم سے ہے

Marfat.com

ان کے معمول بہ تھے وہ سب جمع کر دیئے گئے ہیں۔

شارحین کے بیان کے مطابق امام موصوف نے اپنی وفات سے چالیس سال پہلے اس کو مرتب کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ اس وجہ سے اس کی تالیف کا زمانہ ۱۴۰ھ سمجھنا چاہیے۔ یہ کتاب چالیس سال تک ان کے ہاتھوں میں رہی اور اس کا درس وہ اپنے شاگردوں کو دیتے رہے۔ اس کی شرح زرقانی کے مقدمہ میں ہے کہ جب امام موصوف نے اس کو مدوّن کیا تھا، اس وقت اس میں چالیس ہزار حدیثیں تھیں، لیکن وہ سال بسال کانٹ چھانٹ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے انتقال کے وقت اس میں صرف ایک ہزار روایتیں رہ گئیں۔ اس تعداد میں مراسیل بھی شامل ہیں متصل السند حدیثیں اس کے مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک ہیں۔ معلوم نہیں کہ امام موصوف اور زندہ رہتے تو اس تعداد میں بھی کسی قدر کمی ہو جاتی، کیونکہ حدیثوں کو وہ ظنّی ہی سمجھتے تھے اور ان کے متعلق یہ آیت پڑھا کرتے تھے[1]:

إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ (۴۵:۳۲)

ہم تو صرف گمان رکھتے ہیں، ہم کو یقین حاصل نہیں ہے۔

یہ ہے وہ کُل ذخیرہ حدیث وفقہ کا جو مرکزِ اسلام مدینہ منورہ کا

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۱۳

Marfat.com

سرمایہ ہے۔ یہ امت کے اسلاف کرام کا ترکہ ہے جو امام مالکؒ کی وساطت سے اس کو وراثت میں ملا ہے۔ بیشک امام ابن حزمؒ کے قول کے مطابق "اس میں بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں۔ مثلاً رجم زانی کی روایت نیز اس کے بعض فقہی مسائل میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے لیکن قرآن سے سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

قانونِ عام

خلفائے بنی امیہ کے زمانے میں چونکہ زندگی سادہ تھی، اور مسائلِ شرعیہ میں علمی موشگافیاں نہیں ہوتی تھیں، اِس وجہ سے سلطنت کے لئے عام قانون کی ضرورت کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی، مگر خلفائے عباسیہ نے اپنے تسلط پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کی، اس لئے ان کی خواہش یہ ہوئی کہ ایک مرکزی قانون بنا لیا جائے جس پر سب لوگ چلیں۔ ابن المقفع نے خلیفہ منصور کے سامنے حکمرانی کے متعلق جو تجاویز پیش کی تھیں، ان میں بھی اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا کہ اجماعی اور متفق علیہ نصوص کے مطابق ایک ایسا قانون بنا دیا جائے جس سے سب لوگ واقف ہوں۔ پھر زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح ہوتی رہے چنانچہ منصورؒ نے امام مالکؒ سے درخواست کی کہ موطاؔ کو سلطنت کا قانون عام قرار دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف

حصوں میں لوگوں کا عمل مختلف طریقوں پر رائج ہو چکا ہے۔ منصور نے کہا کیا

Marfat.com

مضائقہ ہے ہم بزور ان کو اس کے اوپر چلائیں گے، اگرچہ وہ راضی نہ ہوئے۔

شیخ محمد عبدہ مرحوم مفتی دیارِ مصریہ کے خیال میں امام مالکؒ کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ خبرِ احاد حجّت نہیں ہے، جس کی رُو سے کوئی بات کسی پر لازم کی جائے، وہ لکھتے ہیں[۱]:

انما یجب العمل باحادیث الاحاد علیٰ من وثق بھا
ولکن لا یجعل تشریعاً عاماً

اخبارِ احاد پر عمل اس کے لئے واجب ہے جو اُن پر وثوق رکھتا ہو،
وہ قانون عام نہیں بنائی جاسکتیں

اس ذیل میں صحیح بخاری کا ذکر بھی مناسب ہے جو علم حدیث کے انتہائی عروج کے زمانے میں لکھی گئی۔

صحیح بُخاری

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ کی مدوّن کی ہوئی ہے۔ یہ امام مالکؒ کی موطا کے ایک صدی کے بعد لکھی گئی جب کہ علمِ حدیث اپنے معراج پر پہنچ چکا تھا اور امام بخاریؒ کے اساتذہ میں سے امام احمد بن حنبلؒ دس لاکھ اور امام یحییٰ بن معین بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے۔ مقدمۂ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاریؒ نے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں ۷۲۷۵ حدیثوں کو اپنے

---

[۱] تفسیر القرآن جلد ۱ ص ۱۳۰

Marfat.com

شروط کے مطابق پایا، جن کو درج کیا۔ ان میں مکررات بھی شامل ہیں، اگر وہ نکال دی جائیں تو حافظ ابن حجرؒ شارح بخاری کے بیان کے مطابق تعلیقات وغیرہ کو چھوڑ کر موصول السند احادیث کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔

یہ خالص حدیث کی کتاب ہے۔ اس میں فقہ صرف اسی قدر ہے کہ اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے۔ حدیث میں یہ سب سے چوٹی کی کتاب ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کی گئی ہے اور اس کی جملہ روایات صحیح مانی گئی ہیں۔

لوگوں کا بیان ہے کہ امام بخاریؒ نے جن حدیثوں کو چھوڑ دیا وہ سب کی سب ضعیف یا غلط نہ تھیں، مگر جن کو انھوں نے چھوڑ دیا، ان کے متعلق بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم کو تو ان روایتوں کو دیکھنا ہے جو انھوں نے لی ہیں کہ کیا وہ سب کی سب صحیح ہیں؟

اس میں کچھ شک نہیں کہ امام بخاریؒ حدیث کے بلند پایہ امام تھے اور صحیح روایتوں کو لینے کے لئے جن جن لوازم اور شرائط کی فنِ رجال کی رُو سے ضرورت تھی انھوں نے سب کا لحاظ رکھا، مگر باوجود ان سب کے چونکہ محدثین کا مدار صرف اسناد کی صحت پر رہ گیا تھا، اس لئے اس کتاب میں ایسی حدیثیں بھی آگئیں، جو درایت کی رُو سے صحت کے معیار پر نہیں اترتیں مثلاً

Marfat.com

اس کے صرف ایک باب کتاب الانبیاء کو لے لیجئے اس میں ہے کہ

۱۔ حضرت سلیمانؑ نے اس اُمید میں کہ ان کی ہر ہر بیوی ایک ایک مجاہد فرزند جنے گی، ایک رات میں اپنی نوّے بیویوں پر گشت لگایا۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ نے ملک الموت کو جب وہ ان کی جان نکالنے آیا، ایسا تھپیڑ مارا کہ واپس لوٹ گیا۔

۳۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کو ساٹھ گز کا پیدا کیا۔

یہ اور اسی قسم کی بعض دیگر روایتیں جو اس میں ملتی ہیں اگر ان کو درایتًا دیکھا جائے اور عقل اور قرآن کی کسوٹی پر کسا جائے تو صحیح نہیں ثابت ہوتیں۔ پہلی روایت نہ صرف عقل بلکہ انسانی فطرت کے لحاظ سے ناممکن ہے۔ دوسری روایت قرآن سے معارض ہے، جس نے عالم ملکوت کے ان محافظوں کو جو انسانوں پر متعین کئے جاتے ہیں۔ ملک الموت کہا ہے سورۃ انعام میں ہے:

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ، حَتّٰٓى إِذَا جَآءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (۶/۶۱)

اور اللہ تمہارے اوپر محافظوں کو بھیجدیتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو (وہی) ہمارے فرستادہ اس کی جان نکال لیتے ہیں:

Marfat.com

سورۃ سجدہ میں ہے :-

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (۱۱)

کہہ دے کہ موت کا وہ فرشتہ تمہاری جان نکالتا ہے جو تمہارے اوپر مقرر ہے

یہ غیر مادّی موکّل نہ تھپڑ مارے جاسکتے ہیں نہ تھپڑ کھاکر واپس لوٹنے والے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی شانِ جلالی کو اس انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے، جیسے کوئی عامل کسی رئیس کے پاس وصولی کے لئے کسی پیادہ کو بھیجے اور وہ اپنے زعمِ ریاست میں تھپڑ مار کر اس کو بھگا دے حالانکہ انبیائے کرام کا شیوہ رضا بہ رضائے الٰہی ہے۔

تیسری روایت صحیح تاریخ کے خلاف ہے۔ چنانچہ خود صحیح بخاری کے بہترین شارح حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ" اقوام کے آثار سے جہاں تک پتہ لگ سکا ہے، انسان کا قد اتنا بڑا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے اب تک کوئی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے[1]"

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، امام بخاریؒ نے اپنے شروط کی مراعات میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی کیونکہ وہ جرح و تعدیل کے مسلّم اور مستند امام ہیں، لیکن ان اسرائیلیات کے ان کی کتاب

---

[1] فتح الباری جلد ۶ - صفحہ ۲۶۱

Marfat.com

میں درج ہو جانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں:-

(۱) وضاعین اپنی روایتوں پر ثقہ راویوں کے نام چسپاں کر دیتے تھے اور یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا امام بھی اس قسم کی جملہ تدلیسوں سے باخبر تھا۔

(۲) خود فنِ رجال ظنّی ہے، اس لئے اس کے اصول کی مراعات سے بھی روایات کی صحت کی ضمانت نہیں ہو سکتی، جس کے چند وجوہ یہ ہیں:-

(۱) اس فن میں رجال کے صدق و کذب کا مدار ان کے ہم عصروں کی شہادتوں پر رکھا گیا ہے، حالانکہ یہ ایسی باطنی صفتیں ہیں، جن کے اوپر سوائے ظنّی اور تخمینی کے یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔

(۲) یہ ہم عصروں کی شہادتیں بھی ہم خیالی، استادی، شاگردی اور دیگر عواطف و میلانات پر مبنی ہیں۔ چنانچہ سُنّی شیعہ راویوں کو اور شیعہ سُنّی راویوں کو من حیث الجماعت غیر معتبر سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے روایت نہیں لیتے۔

(۳) اس فن کی رُو سے جو صادق قرار پا گیا اس کی ہر روایت سچّی اور جو کاذب قرار پا گیا، اس کی ہر روایت جھوٹی سمجھی جاتی ہے اور یہ واقعیت کے خلاف ہے، کیونکہ یہ کیا ضرور ہے کہ جس کو آپ سچا کہہ دیں وہ ہمیشہ سچ بولے اور جس کو جھوٹا کہہ دیں، اس کی ہر بات جھوٹی ہو۔ اس لئے یہ فن حقیقت سے

Marfat.com

بعید ہو گیا۔ مُلّا علی قاری کا یہ قول کہ

> یہ حدیثوں کی صحت، تمام تر وہ ہے جو محدّثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتی ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو[1]

دراصل فنِ رجال پر صحیح تنقید ہے اور انھوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ نہ صرف روایات بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنّی ہے۔

اِن ظنّیات کو دینی حجّت ماننے کی کوئی دلیل اس کے سوا نہیں ہے کہ:۔

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۲)

ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک راہ پر پایا اور ہم بھی انھیں کے نقوشِ قدم پر رستے سے لگے ہوتے ہیں۔

اِختلافات

چونکہ جرح و تعدیل ظنّی ہے اور روایات کی تصحیح اسی کی بنیاد پر کی گئی ہے، اس وجہ سے محدّثین کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثوں میں بھی بے حد اختلافات ہیں، جن سے مختلف فرقے اور خیال کے لوگ اپنے اپنے حسبِ منشا استدلال کرتے ہیں۔ ان میں باہم مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں

---

[1] موضوعاتِ کبیر ص ۱۶

Marfat.com

کی گئی ہیں، ان میں اس قدر تکلّف ہے کہ مخالفوں سے تسلیم کرانا مشکل ہے اور بعض بعض تو اس قدر متضاد ہیں کہ ان میں تطبیق ہو ہی نہیں سکتی اور چونکہ فقہ کا مدار آیات سے زیادہ روایات پر ہے، اس وجہ سے اس میں بھی اس کے آثار نمایاں ہیں اور مسائل میں بیحد اختلافات ہو گئے ہیں۔

روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہا، حج کے لئے آتے ہوتے ہیں۔ پہلے میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس پہنچا اور اُن سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگاتے تو کیا وہ جائز ہوگی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے بھی جاکر یہی سوال کیا، انھوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبرمہ سے جاکر دریافت کیا، بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہا ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں رایوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں، مجھے تو حدیث ملی ہے:

Marfat.com

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع وشرط

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلےٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا انھوں نے کہا کہ حدثنی ھشام عن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃؓ قالت امرنی رسول اللہ ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء لانفسہم فقال رسول اللہ ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل۔ یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ ولاء ان کی رہے گی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا، انھوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا کہ حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعتُ النبی بعیرا وشرطتُ لی حملانہ الی المدینۃ۔ یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلافات پر ہی نہیں ہے،

Marfat.com

بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑکر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہوجاتی اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

خاتمہ

اِن تمام بیانات کو جو حقائق پر مبنی ہیں، دیکھنے کے بعد ہر سوچنے اور سمجھنے والا شخص اس حتمی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ قرآن دین کی مستقِل کتاب ہے اور اجتماعی اور انفرادی ہر لحاظ سے ہدایت کے لئے کافی ہے۔ وہ انسانی عقل کے سامنے ہر شعبۂ حیات میں اتنی روشنی رکھ دیتا ہے کہ وہ اس کے نور میں اللہ کی مرضی کے مطابق کام کر سکے۔ باقی رہی حدیث اور فقہ، سو حدیث کا صحیح مقام "دینی تاریخ" ہے اور فقہ کا "ہنگامی اجماع یا قیاس"۔

Marfat.com

وضع حدیث

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو شخص میرے اوپر قصداً جھوٹ بولے وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنالے"۔ یہ حدیث اتنے صحابہ سے مروی ہے کہ بعض بعض ائمہ حدیث نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے، لیکن باوجود اس وعید کے بھی ایسے لوگ تھے جو اُسی زمانے سے جھوٹی حدثیں گھڑنے لگے۔ ملا علی قاری نے موضوعاتِ کبیر میں امام طبرانی کی اوسط اور ابن عدی کی کامل کے حوالے سے لکھا ہے کہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر حیِّ بنی لیث میں کسی شخص نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا، جس کو اس عورت کے سرپرستوں نے نامنظور کر دیا۔ وہ شخص حلّہ نبوی کے مشابہ ایک لباس پہن کر وہاں گیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حُلّہ عطا فرمایا ہے اور اختیار دیا ہے کہ میں تمہاری عورتوں کے بارے میں جو چاہوں حکم دُوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ کا فرمان سر آنکھوں پر۔ یہ کہہ کر اس کو ایک مکان میں ٹھہرایا اور اپنے دو آدمی تصدیق کے لئے دربارِ رسالت میں بھیجے۔ آں حضرتؐ سُن کر

Marfat.com

نہایت برہم ہوئے اور ایک انصاری کو حکم دیا کہ جاکر اس کو قتل کر کے آگ میں جلادو۔ جب وہ انصاری پہنچے تو دیکھا کہ سانپ کے کاٹ لینے سے وہ مر چکا تھا۔ انھوں نے اس کی لاش کو آگ میں جلا دیا اور واپس چلے آئے۔

شیخ طاہر جزائری اپنی کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر کے صفحہ ۲۴۶ میں لکھتے ہیں:

وقد کُذِب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو حیٌ وقد کان فی عصر الصحابۃ منافقون و مرتدون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی زندگی ہی میں جھوٹ بولا گیا اور زمانۂ صحابہؓ میں منافقین و مرتدین تھے۔

عہدِ صحابہؓ

صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القراٰن ومن کتب عنی شیئًا غیرہ فلیمحہ

مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا تو اس کو مٹا ڈالے۔

علماء نے اس کی توجیہ یہ لکھی ہے کہ قرآن کی حفاظت کے لئے یہ حکم دیا تاکہ کوئی دوسری چیز اس کے ساتھ غلط ملط نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت

Marfat.com

یہ وجہ نہ تھی، ورنہ آپ یہ حکم دیتے کہ قرآن کو الگ لکھو اور روایتوں کو الگ۔ بلکہ مقصد اس ممانعت کا یہ تھا کہ لوگ روایات میں نہ پڑ جائیں، کیوں کہ جب روایات کا سلسلہ چلتا ہے تو سچ کے ساتھ جھوٹ بھی پھیلنے لگتا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ اول ہی کے عہد میں لوگ روایتوں میں اختلاف کرنے لگے اور جب انھوں نے دیکھا تو لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم روایات میں اختلاف کرتے ہو، ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعہ احادیث بھی لکھا تھا، جس میں تقریباً پانچ سو حدیثیں تھیں، مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہؓ سے لے کر آگ میں جلا دیا، کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھ دی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو۔[2]

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مجموعہ میں جملہ حدیثیں ایسی تھیں کہ انھوں نے لوگوں سے سن کر لکھی تھیں، کیونکہ وہ خود دربارِ رسالت کے رُکن رکین تھے اور اپنے کان سے آنحضرتؐ کی باتیں سنتے تھے، جن میں اُن کو شبہ کی گنجایش نہ تھی، لیکن چونکہ روایات میں اختلاف اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اُمت کو بہ حیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے انھوں نے اس سے روک دیا تھا، اس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ذکر ابی بکر [2] تذکرۃ الحفاظ

Marfat.com

لئے خود بھی پسند نہ کیا کہ روایات کا مجموعہ چھوڑ جائیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص نے بھی کچھ فرمودۂ نبوی اپنے پاس لکھ رکھا تھا، لیکن یہ مجموعہ بھی کسی کو نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ ضائع ہو گیا یا انھوں نے بھی حضرت ابو بکرؓ کی طرح اس کو جلا دیا۔

ساری آفت منافقوں کی وجہ سے تھی جو سنتے کچھ تھے اور بیان کچھ کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کے بعد عہد صحابہ میں منافقین کے ساتھ مرتدین کی بھی جماعت تھی۔ اسی وجہ سے حضرت ابو بکرؓ نے روایت حدیث کی ممانعت کی اور بعض بعض معتمد صحابہ نے جو روایتیں کیں، ان پر شہادت طلب فرمائی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں اور بھی سختی کی اور لوگوں کو روایت میں پڑنے سے منع فرمایا۔ اگر کوئی روایت بیان کرتا تو جب تک اس کے گواہ نہ لے لیتے نہ چھوڑتے، لیکن باوجود اس کے روایتیں پھیلیں اور کچھ لوگ اگر سچی روایتیں بیان کرنے والے تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جھوٹ گھڑنے لگے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباس کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بشیر نے کہا کہ بات کیا ہے جو آپ میری حدیثیں نہیں سنتے۔ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بیان کرتا تو ہم جھپٹ کر اس کی طرف بڑھتے اور کان لگا کر سنتے۔

Marfat.com

مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں شروع کیں۔ اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

یہی وجہ تھی کہ اکثر صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم نے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں۔ حضرت زید بن ارقم سے ابن ابی لیلےٰ نے کہا کہ کوئی حدیث رسول سنائیے۔ انھوں نے کہا کہ ہم بوڑھے ہوگئے اور بھول گئے۔ حضرت زبیر سے ان کے بیٹے عبداللہ نے فرمائش کی کہ آنحضرتؐ کی کوئی حدیث بیان کیجیے۔ انھوں نے بھی اسی طرح کا جواب دیا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکّہ تک گیا، مگر ایک روایت بھی نہ سُنی۔ امام شعبی کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں ایک سال تک رہا، لیکن انھوں نے کوئی حدیث بیان نہ کی۔

زمانہ مابعد عہدِ صحابہ کے بعد سے کذّابین اور وضّاعینِ حدیث کی کثرت بڑھتی گئی۔ علّامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق اس کے اسباب حسبِ ذیل تھے:

۱۔ بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا، حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

۲۔ بعض اہلِ علم کی یادداشتیں ضائع ہوگئیں اور انھوں نے مجبوراً حافظہ سے روایت کی اور جو خیال میں آیا کہہ گئے۔

Marfat.com

۳۔ بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دے دیا تھا، غلط روایتیں کیں۔

۴۔ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سہواً غلط روایت کی اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے بھی اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف سمجھا۔

۵۔ زنادقہ نے شریعت کو مٹانے کے لئے جھوٹی حدیثیں گھڑیں۔

۶۔ جب مذہبی تفرقہ پیدا ہو گئی اور سنی، شیعہ، خارجی، قدری، جہمی، مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے، اُس وقت ہر ایک فرقہ کے لوگوں نے دوسروں کے مقابلہ کے لئے اپنی اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں۔

۷۔ بہت سے عابد اور زاہد لوگ ایسے تھے کہ عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور بُرے کام سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گھڑتے تھے۔ ابن جوزی کے بیان کے مطابق یہ لوگ شریعت کو نامکمل سمجھتے تھے۔ جس کی تکمیل ان روایات سے کرتے تھے۔

۸۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے، جن کا خیال تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہ تک پہنچا دینا جائز ہے۔

۹۔ سلاطین کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسبِ منشا روایتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

Marfat.com

۱۔ قصہ گو، واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرتے تھے، کیوں کہ ان کی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ وہ دس وجوہ ہیں، جن کے باعث مکذوب و مجہول روایتیں مسلمانوں میں پھیلیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں، حدیثیں بنائیں اور مشرق سے مغرب تک ان کو پھیلایا اور ان سے بھی زیادہ اُن لوگوں نے جو اپنے علم اور تقدس کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھانا چاہتے تھے، نئی نئی حدیثیں وضع کیں۔

شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ ایک محدث نے آخر عمر میں توبہ کی۔ اس وقت اس نے لوگوں سے کہا کہ ذرا دیکھ بھال کر حدیثوں کو قبول کیا کرو، کیوں کہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسبِ منشا دیکھتے تھے تو اُس کو حدیث بنا لیتے تھے۔ (یعنی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیتے تھے)

ان واضعین میں کچھ لوگ ایسے تھے جو مخفی طور پر جھوٹی حدیثیں اپنی جماعت میں پھیلاتے تھے۔ اگر ان کا پایہ اعتبار کم ہوتا تھا تو بڑے بڑے بزرگوں کے ناموں سے ان کو روایت کرتے تھے۔ ایسی بھی [illegible]ن ہیں کہ اپنے شیوخ کو غافل پا کر دسیسہ کاری سے اپنے مجعولات ان کی کتابوں میں درج کر دیتے تھے۔

Marfat.com

اور کچھ لوگ علی الاعلان مکذوب روایتیں بیان کرتے تھے۔ کوئی تو اپنی گرمی بازار کے لئے اور کوئی ثواب اور جہاد سمجھ کر۔ چنانچہ نوح بن ابی مریم نے قرآن کی ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔ جن کو مفسرین اور خاص کر بیضاوی نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔ جب ائمہ حدیث نے ان کی تحقیق شروع کی تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے یہ حدیثیں خود بنائی ہیں، تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔ یہی حال اکثر اُن رواۃ کا تھا، جنھوں نے ترغیب یا ترہیب کی حدیثیں روایت کی ہیں۔

واعظین اور قصہ گو تو نہایت بے باکی اور جرأت سے کام لیتے تھے، موضوعاتِ کبیر میں مُلّا علی قاری لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معینؒ[1] نے مسجد رُصافہ میں نماز پڑھی۔ وہاں ایک واعظ نے بیان کرنا شروع کیا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے عبدالرزاق سے، انھوں نے معمر سے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے حضرت انسؓ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ "جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اس کلمے کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پر زمرد کے" آخر تک تقریباً بیس ورق کی حدیث بیان کی۔ اس طویل داستان کو سُنکر ان دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو حیرت کے ساتھ دیکھا۔ اس کے بعد

---

[1] حدیث کے امیرالمومنین بولے جاتے ہیں اور ائمہ جرح و تعدیل میں ممتاز ہیں۔

Marfat.com

یحییٰ بن معین نے واعظ کو اپنی طرف بلایا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سُنی ہے۔ اس نے کہا احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے۔ انھوں نے کہا میں یحییٰ ہوں اور یہ احمد بن حنبل، ہم دونوں میں سے کسی نے آج سے پہلے اس روایت کو سنا تک نہیں تھا۔ تم کو اگر جھوٹ ہی بولنا تھا تو ہمارے سوا کسی اور کا نام لیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ آج تحقیق ہوگئی، پوچھا کہ یہ کیوں کر، بولا کہ سترہ یحییٰ بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل، جن سے میں نے روایت کی ہے۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دنیا میں ایک اکیلے تمھیں یحییٰ بن معین ہو۔ یہ سُن کر انھوں نے آستین مُنہ پر رکھ لی اور چُپ چاپ چلے آئے۔

محمد بن عبداللہ کا قصہ اس سے بھی زیادہ دل چسپ ہے۔ اس نے موصل میں پہنچ کر عجیب و غریب حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ علماء کو جب اس کی خبر ہوئی تو ان میں سے چند نے ارادہ کیا کہ جاکر اس کی تردید کر دیں۔ وہ مجمع میں سرگرمِ تقریر تھا۔ اس نے جب علماء کو آتے دیکھا تو معاملہ کو سمجھ گیا، فوراً حضرت جابرؓ سے ایک روایت بیان کرنی شروع کی کہ "قرآن کلام اللہ ہے اور غیر مخلوق"[1]۔ اب عوام کے خوف سے ان علماء کو جرأت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہیں۔

---

[1] اس زمانے میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی، جو عالم قرآن کو غیر مخلوق کہہ دیتا عوام میں مقبول ہو جاتا۔ پھر اس کی کوئی بات قابلِ تردید نہ خیال کی جاتی۔

Marfat.com

ذہبی نے میزان الاعتدال میں امام شعبی[1] کا بیان نقل کیا ہے کہ "میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ اس میں ایک دراز ریش واعظ کھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا۔ اس نے اسناد کے ساتھ یہ روایت بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے دو صُور پیدا کئے ہیں ہر ایک دو دو بار پھونکا جائے گا۔ میں نے جلدی سے نماز ختم کر کے کہا کہ اے شخص! اللہ سے ڈرا اور جھوٹی حدیثیں نہ بیان کر۔ صُور تو صرف ایک ہی ہے۔ اس نے کہا کہ کیسا فاجر آدمی ہے جو بڑے بڑے بزرگوں کی روایت کو جھٹلاتا ہے، اس کی زبان سے یہ نکلنا تھا کہ عوام مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے اور جب تک مجھ سے اقرار نہ لے لیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیس صور پیدا کئے ہیں اس وقت تک نہ چھوڑا۔

ائمہ حدیث نے جب تنقید شروع کی تو ان واضعین وضعفاء کے تراجم جمع کر کے کتابوں میں مدوّن کئے۔ چنانچہ علوم حدیث میں سے علم الضعفاء و الوضاعین بھی ایک اہم علم بن گیا جس میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ چند مشہور کتب یہ ہیں:۔

کتاب الضعفاء	امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ
"	ابو عبداللہ برقی متوفی ۲۴۹ھ
"	ابو اسحٰق جوزجانی متوفی ۲۵۹ھ

---

[1] تابعین میں بڑے پایہ کے امام ہیں۔ حجاج کے زمانہ میں کوفہ میں تھے۔

Marfat.com

کتاب الضعفاء	ابوجعفر عقیلی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابونعیم اسمرابادی متوفی ۳۲۳ھ
"	ابوالفتح محمد متوفی ۳۷۴ھ
"	ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ (یہ کتاب کامل کے نام سے مشہور ہے اور ۱۲ جلدوں میں ہے)
"	ابن ابی حاتم (چھ جلدوں میں)

کثرتِ موضوعات

جب وضاعین کی اس قدر کثرت تھی کہ ان کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے گئے، تو ظاہر ہے کہ موضوع احادیث کی کس قدر کثرت ہوتی ہوگی۔ عقیلی کا قول مُلّا علی قاری نے موضوعاتِ کبیر میں نقل کیا ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔ تذکرۃ الموضوعات میں شیخ محمد طاہر گجراتی لکھتے ہیں، کہ جونباری، ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار سے زیادہ حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجاء کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب اس کو قتل کرنے کے لئے لے گئے، تو اس نے کہا کہ مَیں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتا رہا ہوں۔

روایات کا تو کیا ذکر ہے۔ بعض بعض وضاعین نے پوری پوری کتابیں روایات کی تصنیف کر ڈالیں، جو اوّل سے آخر تک غلط تھیں۔

Marfat.com

تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۸ میں ہے:

"کتب حدیث میں بعض کتابیں ایسی ہیں کہ ان کی جملہ روایات موضوع ہیں۔ منجملہ ان کے القضاعی کی کتاب ہے۔ پھر اربعون ودعانیہ۔ ان دونوں میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ "وصایا علی" نامی کتاب میں بھی بجز پہلی حدیث کے باقی سب غلط ہیں۔ انس بصری کی مسند جو تین سو حدیثوں کا مجموعہ ہے سرتاسر غلط ہے۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن جعفر نے اپنے آباء کی روایت سے جو حضرت علیؓ تک پہنچائی گئی تھی ایک کتاب نکالی جو ہزار حدیثوں کا مجموعہ تھی۔ اس کی تمام حدیثیں منکر۔ دارقطنی نے کہا کہ یہ کتاب "علویات" جھوٹ اور افترا کا مجموعہ ہے۔ اللہ اس کے واضع پر لعنت کرے۔ اس نے جماع اور طریقہ جماع کے متعلق بھی حضرت علیؓ کے نام سے وصیتیں روایت کی ہیں۔

دیلمی نے لکھا ہے کہ ابوالفضل جعفر بن محمد حسینی کی کتاب العروس منکر اور غیر معتبر ہے اور امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق بن ابراہیم نے اپنے باپ اور دادا کی روایت سے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو ہرگز اس قابل نہیں کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔

کتب موضوعات

جب احادیث کی پڑتال شروع کی گئی، اس وقت ائمہ جرح و تعدیل نے جہاں کذابوں کا پتا لگانے کی کوشش کی، وہاں ان کی روایتیں بھی چھانٹ کر نکال لیے گئے اور جو ان کے نزدیک حتمی طور پر موضوع ثابت ہو گئیں، ان کے مجموعے تیار کر دیئے۔ ان میں

Marfat.com

جو کتابیں مشہور ہیں وہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

کتاب الاباطیل	ابو عبداللہ الحسین ہمدانی متوفی ۵۴۳ھ
الموضوعات الکبریٰ	ابوالفرج عبدالرحمن بن جوزی متوفی ۵۹۷ھ (چار جلدوں میں ہے)
مختصر الموضوعات	امام سفارینی
اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ	جلال الدین سیوطی
تذکرۃ الموضوعات	شیخ محمد طاہر گجرات پاک پٹن کے مشہور ہندی محدث مقتول ۹۸۶ھ
رسالتان فی الموضوعات	رضی الدین صنعانی متوفی ۶۵۰ھ
الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ	شیخ ابو عبداللہ محمد شامی متوفی ۹۴۲ھ
؍؍	امام شوکانی یمنی متوفی ۱۲۵۰ھ
کتاب المغنی	حافظ ضیاء الدین موصلی متوفی ۶۲۳ھ
الموضوعات الصریحہ	عمر بن بدر
الکشف الالٰہی	محمد سندروسی متوفی ۱۱۷۷ھ
تذکرۃ الموضوعات	ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ
اللؤلؤ المرصوع	محمد بن خلیل قاوقجی متوفی ۱۳۰۵ھ

Marfat.com

ان وضاعین اور موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی جس کا اندازہ مشکل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپ سے روایت کی گئی ہیں، ان کا ۹۹ فی صدی حصہ مدنی زندگی سے متعلق ہے جس کی کُل مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین وکذابین کی ایک بے شمار فوج ہوگئی، جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی تھی بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ یہی تھا۔ ان ہزاراں ہزار وضاعین نے لاکھوں حدیثیں وضع کر ڈالیں اور ان کو پھیلا دیا۔ اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلاشبہ صحیح تھیں اس طرح مخلوط ہوگئیں کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہوگیا کہ اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں۔

تنقید حدیث ائمہ حدیث نے جب حدیثوں کو پرکھنا شروع کیا اور صحیح اور غلط کو الگ الگ کرنے لگے اس وقت دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک خود حدیث کو، دوسرے رواۃ کو۔

موضوع حدیث کی شناخت کے لئے انھوں نے حسب ذیل اصول قرار دیئے:-

۱۔ صحیح تاریخ کے خلاف ہو۔

۲۔ رافضی صحابہ کے یا خارجی اہل بیت کے مطاعن میں روایت کرے۔

Marfat.com

۳۔ حدیث میں ایسا واقعہ ذکر کیا جائے، جس کے بیان کرنے والے بہت سے ہو سکتے ہوں مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو۔

۴۔ قرآن کے خلاف پڑے۔

۵۔ عقلِ صحیح کے خلاف ہو۔

۶۔ چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔

۷۔ قرینہ یا موقع کے خلاف معلوم ہوتی ہو۔

لیکن اِن اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ جھوٹی حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے تاکہ کوئی گرفت نہ کر سکے۔ چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بڑے بڑے قانون دانوں کی جرح کے بھی جھوٹے گواہ اپنی شہادتوں میں پورے اُتر جاتے ہیں اور کبھی کبھی سچے گواہوں سے زیادہ قابلِ اعتبار قرار پا جاتے ہیں، لہٰذا یہ اصول جو غلط روایتوں کی پہچان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، تقریباً بیکار ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ائمہ جرح و تعدیل نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی ثقاہت پر زیادہ دار و مدار رکھا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ثقاہت ایک باطنی وصف ہے۔ اس کی تمیز کی بنیاد کس امر پر رکھی جائے۔ رہا ظاہری تقویٰ اور طہارت تو اس کی بابت خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان جو جرح و تعدیل

Marfat.com

کے عظیم الشان امام ہیں، کہتے ہیں کہ اہلِ صلاح و خیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم کا قول ہے کہ اہلِ خیر کی زبان سے بِلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔

ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم، زُہد، عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی، مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے بارے میں بھی کوئی شہادت دے تو میں قبول نہیں کروں گا۔[1]

اس لئے مجبوراً رواۃ کی صداقت، ثقاہت اور عدالت کا مدار شہرت اور مقبولیت پر رکھا گیا، یعنی ان لوگوں کی روایت لی جائے، جن کی ثقاہت اہلِ علم میں مقبول اور مشہور ہو۔

حدیثیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے دوسری صدی ہجری کے آغاز سے کتابوں میں لکھی جانے لگیں۔ گو اُس وقت بھی لوگ جانچ کرتے تھے، مگر اصل تنقیدِ حدیث کا زمانہ تیسری صدی ہے۔ بیشتر ائمہ جرح و تعدیل اسی عہد میں ہوئے[2]۔ ان ائمہ میں بھی تسامح موجود تھا۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے:

> "ابن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایت کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایت میں نرمی۔"

---

[1] توجیہ النظر صفحہ ۲۰۵ [2] مثلاً احمد بن حنبل یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، امام بخاری مسلم اور ارباب سنن وغیرہ۔

Marfat.com

ملا علی قاری موضوعاتِ کبیر میں لکھتے ہیں:

هذا كله يظهر للمحدثين من حيث نظرهم الى الاسناد والا فلا مطمع للقطع. لتجويز العقل ان يكون الصحيح في نفس الامر موضوعًا والموضوع صحيحًا

یہ سب کچھ وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

چنانچہ جملہ اصولیین اور ائمہ محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے، یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے[1]! انھوں نے احادیث پر جو احکام لگاتے ہیں، مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، موضوع، منکر اور مردود۔ ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے ورنہ روایت کی تو صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، صحیح یا غلط۔

غرض حدیث کی جو تنقید ہوتی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ بحث کی

---

[1] شیخ طاہر جزائری لکھتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن کو متواتر کہا گیا ہے۔ درحقیقت ان میں تو صرف تواترِ معنوی ہے۔

Marfat.com

گنجائش ہے علامہ ابن جوزی نے جو حدیث میں کسی قدر متشدد تھے۔ اپنی کتاب الموضوعات الکبریٰ میں سنن اربعہ کی بہت سی حدیثوں بلکہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم کی بھی متعدد حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ علماء نے رفع امان کے خیال سے ان کی تردید کی، لیکن دلیل بجز اس کے اور کچھ نہ دی کہ یہ مسلم چلی آتی ہیں۔

حافظ ابن حجر جو باوجود اس کے کہ حدیث میں بہت نرم ہیں، لکھتے ہیں کہ ابن جوزی نے بھی اس قدر موضوعات چھوڑ دی ہیں کہ ان کی کتاب کے برابر (یعنی چار جلد کی) ایک دوسری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

موضوعات کا اثر

اگرچہ ائمہ محدثین نے ان مکذوبات سے امت کو بچانے کی کوشش کی، لیکن ان کا تسلط دلوں پر اس قدر ہو گیا تھا کہ آج تک ہزاروں موضوع حدیثیں مسلمانوں کا دینی سرمایہ بنی ہوئی ہیں اور ان کے عقائد و اعمال میں دخیل ہیں۔

یوں تو باب الطہارت سے لے کر باب الحشر والنشر اور باب الجنۃ والنار تک ایک بھی ایسا نہیں ہے جس میں موضوعات نہ ہوں، لیکن بعض ابواب ایسے ہیں کہ ان میں صرف موضوعات ہی ہیں یا انھیں کی کثرت ہے۔ مثلاً

صلاۃ تسبیح	ایک حدیث بھی صحیح نہیں
صلاۃ حاجت	"

Marfat.com

صلاۃ اسبوع — ایک حدیث بھی صحیح نہیں

صلاۃ الفیہ "

تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً ابوطالب مکی کی قوت القلوب یا ثعلبی وغیرہ کی تفسیروں سے جنھوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شب قدر کہہ دیا، لوگوں نے اس میں صلاۃ الفیہ جاری کی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کیں اور عید سے بھی زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کرلی جس میں اس قدر فسق و فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نہ نازل ہو جائے۔ سب سے پہلے اس کا رواج بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں ہوا۔ پھر سارے شام اور مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علمائے مصلحین نے توجہ کی، جن کی کوشش سے یہ بدعت مٹ گئی، تاہم اس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتدا برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لاتے تھے، انھوں نے دین اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم کو تازہ کیا۔ اسی نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کرلی جو مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔

زیارت قبر نبی — ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔

فضائل ائمہ اربعہ "

Marfat.com

فضائل عرب وزبانِ عربی — ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔

مذمتِ عجم وزبانِ عجمی — "

فضائل ابدال واوتاد وقطب غوث — "

صوفیہ کی کل مشہور حدیثیں موضوعات کی فہرست میں داخل ہیں۔ مثلاً

کُنتُ کنزاً مخفیاً فاَحْببْتُ اَن اُعرفَ فخلقت الخلق

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر

اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک

ذرۃ من اعمال الباطن خیر من الجبال الرواسی من اعمال

الظاہر القلب بیت الرب۔

ان للہ سبعین حجاباً من نور وغیرہ

علماء اور متکلمین کے فضائل میں بھی تمام حدیثیں خودساختہ ہیں۔ مثلاً

علماء کی سیاہی شہدا کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

ایک فقیہ شیطان کے لئے ہزار عابد سے گراں تر ہے۔

علماء انبیا کے وارث ہیں۔ یا میری اُمت کے علماء بمنزلہ انبیاء بنی اسرائیل

کے ہیں۔

جو شخص طلب علم کے لئے نکلتا ہے، فرشتے اس پر اس کے پاؤں کے نیچے،

Marfat.com

اپنے پر پھیلاتے ہیں۔

عالم کی طرف ایک نگاہ ڈالنا ساٹھ سال کے قیام اور صیام سے بہتر ہے۔

طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم۔

العلم علمان۔ علم الادیان وعلم الابدان وغیرہ۔

فضائل صحابہ	اکثر حدیثیں موضوع ہیں۔
مناقب اہلِ بیت	"
ہدیہ اور تحفہ کی فضیلت	"
نکاح کی فضیلت اور عورتوں کی مدح	"
فضائلِ درود	"
مدائح نبی صلی اللہ علیہ وسلم	" مثلاً

لولاك لما خلقت الافلاك

کنت نبیًا وآدم بین الماء والطین

انا مدینة العلم وعلیؓ بابھا

انا افصح العرب والعجم

امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں

مغازی۔ ملاحم اور تفسیر۔ ہرچند کہ علماء نے اس کی تاویل کی ہے لیکن فی نفسہٖ یہ

قول کسی تاویل کا محتاج نہیں۔ چند حدیثیں ان ابواب میں اگر صحیح ثابت

Marfat.com

ہوگئیں تو مستثنیات میں ہیں۔

افتراقِ اُمت کے متعلق جتنی حدیثیں ہیں موضوع ہیں۔ مثلاً "یہود و نصاریٰ کے ۷۲ فرقے ہوئے اور میری اُمت کے ۷۳ ہوں گے جن میں سے صرف ایک جنتی ہے"۔ اس کی غلطی واقعتاً بھی ظاہر ہے، کیونکہ ۷۳ فرقے مسلمانوں کے چوتھے اور پانچویں ہی صدی ہجری میں علماء نے شمار کر دیئے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک سینکڑوں فرقے بنے اور بنتے جا رہے ہیں۔

موضوع صحابہ

اگرچہ ائمہ محدثین اور جملہ اہلِ تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ رُوئے زمین میں سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے، وہ حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ ہیں، جنھوں نے مکہ میں ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ مگر ان کذابوں اور وضاعوں نے زمانہ مابعد میں بہت سے طویل العمر صحابہ مخترع کر لیے۔ منجملہ ان کے یہ لوگ ہیں:

جبیر بن حرب: حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ امیر عبدالکریم بن نصر کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ ۵۷۳ھ میں ان کی زیارت کی تھی۔

ابوعبداللہ محمد ثقلی: پانچویں صدی ہجری میں تھے۔ ان کے بارے میں بیان کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا تھا۔ لوگ جا کر تبرکاً ان سے مصافحہ کرتے تھے۔

Marfat.com

قیس بن تمیم: ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت علیؓ کے خچر نے لات ماری تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز یعنی ۵۱۷ھ میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔ گیلان میں رہتے تھے۔

بابا رتن ہندی: متوفی ۶۳۲ھ۔ ان کی نسبت کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ ہندوستان میں رہتے تھے۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے ان کی زبان سے طرح طرح کی روایتیں اُمت میں پھیلائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ سند عالی کے خیال سے ان ثلاثیات کو کتابوں میں درج کرتے تھے۔ علماء کی ذہنیت اس قدر جامد تھی کہ جب ائمہ حدیث ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو بعض لوگوں نے ان کے ساتھ مجادلہ کیا۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدالدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے جب ان خرافات کی تغلیط کی تو علامہ صفدی ان کی تردید کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

Marfat.com

شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث

(نوشتہ دسمبر ۱۹۴۱ء)

جب کوئی قوم اپنے مرکز سے ہٹ جاتی ہے تو چونکہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند مقصد نہیں رہتا اس لئے رفتہ رفتہ اس کے فکر و عمل کی قوتیں مضمحل ہوتی چلی جاتی ہیں اور بالآخر ان پر جمود و تعطل (مسکنت) کا عذاب اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں حرکت باقی نہیں رہتی، سہل انگاری کی زندگی ان کی فطرت ہو جاتی ہے۔ نہ ذہن میں سوچنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ دل میں کوئی ولولہ۔ نہ بازوؤں میں قوتِ عمل ہوتی ہے نہ پاؤں میں چلنے کی ہمت۔ اس سہل انگاری اور آرام پسندی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس ڈگر پر چلتے آرہے تھے اسی پر چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کریم نے اُمم سابقہ کے احوال و کوائف سے بار بار اس طرف توجہ منعطف کرائی ہے کہ حق کی دعوت کو سب سے پہلے ہمیشہ ان لوگوں نے ٹھکرایا، جن میں آرام طلبی اور سہل انگاری پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ ہمیں سوچنے کی کچھ ضرورت نہیں، ہمارے آباؤ اجداد جس رَوِش پر چلے آرہے تھے وہی رَوِش ہم نے اختیار کر رکھی ہے اب اس میں تبدیلی پیدا کرنا گویا راہ راست سے ہٹ کر گمراہی اختیار کرنا ہے

Marfat.com

حالانکہ ان کا تجزیہ نفس کیا جائے تو یہ حقیقت فوراً سامنے آجاتی ہے کہ وہ آباؤاجداد کی روش سے اس لئے نہیں ہٹنا چاہتے تھے کہ ان میں جمود و تعطل آچکا تھا۔ وہ اس قدر آرام طلب ہو چکے تھے کہ جہاں بیٹھ گئے تھے وہاں سے اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسی سہل انگاری کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے "حصولِ نجات" کے لئے بھی بڑی بڑی آسان راہیں وضع کر رکھی تھیں۔ ذرا غور فرمائیے اگر ایک شخص یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ اپنے مکان کے ایک گوشے میں نرم و نازک قالین کے مصلّے پر بیٹھ کر۔ (سردیوں کے موسم میں) نہایت نفیس و لطیف شال اوڑھے اِدھر اُدھر تکیہ لگائے آتشدان میں آگ سُلگاتے اور آگ میں لوبان چھڑکاتے تسبیح کے دانوں پر چند الفاظ دُہرا لینے سے سیدھا جنّت میں پہنچ سکتا ہے تو وہ بھلا ایسے شخص کی آواز پر کیسے کان دھر سکتا ہے جو یہ کہے کہ جنّت کا راستہ یہ نہیں۔ جنّت کی راہ اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے عیش و عشرت کا سامان چھوڑ کر باطل کی بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لینا اور اس کے لئے کوہ و دشت و بیاباں میں سر بکف پھرنا، بھوک اور پیاس کی مشقتیں برداشت کرنا اور پھر عندالضرورت جان جیسی متاعِ عزیز قربان کر دینا ہے۔ یہ مثال جسمانی سہل انگاری کی ہے۔ اسی طرح ذہنی سہل انگاری کی کیفیت ہے۔ جو یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ علم کی تکمیل ان چند کتابوں کے از بر کر لینے میں ہے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے اسلاف نے لکھ دی ہوں اور ان پر کسی قسم کا اضافہ یا تنقید

Marfat.com

گناہِ عظیم ہے وہ اس شخص کی کیوں سُنے جس کی پکار یہ ہو کہ صحیح علم اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے سے حاصِل ہوتا ہے اور اس کے لئے عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی ضروری ہے۔ اس کی ذہنی سہل انگاری اسے اس طرف آنے کی اجازت ہی نہ دے گی۔ لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرے گا کہ وہ سہل انگاری اور آرام طلبی کی وجہ سے اس طرف نہیں آتا نفس انسانی بڑا حیلہ تراش واقع ہوا ہے۔ وہ یہ کہہ کر فریب دیگا کہ نہیں! حق کی راہ وہی ہے جس پر میں چل رہا ہوں اور اس کی سند یہ ہے کہ میں نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی راہ پر چلتے دیکھا ہے:۔

اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ (۵/۱۰۴)

خواہ ان کے آباؤ اجداد کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور وہ راہِ راست پر بھی نہ ہوں۔

جمود و تعطّل

مسلمانوں پر ایک عرصہ سے یہی جمود و تعطّل مسلّط ہے جس نے ان کے افکار و اعمال کی قوتوں کو یکسر بے کار کر رکھا ہے۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ انہیں زندگی بخش روش کی طرف دعوت دیتا ہے تو ان کے ارباب سیادت اس سے گھبرا اٹھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے تاکہ ان

Marfat.com

کی نیند میں فرق نہ آنے پائے۔ پھر یہ لوگ اپنی ذہنی سہل انگاری کی وجہ سے دعوت دینے والے کے دعوے کا جواب بھی دلیل و حجت سے نہیں دیتے بلکہ اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس پر ایک ایسا لیبل چسپاں کر دیا جائے جس سے عوام مشتعل ہو جائیں اور یوں اسے نکو بنا دیا جائے۔ اگلے دنوں ہمارے ایک دوست نے اسی قسم کے لیبل کی ایک بڑی دلچسپ بات سُنائی، آج سے کچھ عرصہ پہلے جب جماعتِ اہلِ حدیث نے جہالت ذلو ہم پرستی کی رسوماتِ قبیحہ کے خلاف آواز بلند کی تھی تو ان کے لئے "وہابی" کا لیبل وضع کیا گیا تھا اور عوام میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت "وہابی" ہوتا ہے۔ سرحد کے ایک گاؤں میں ایک ہندو دُکاندار تھا۔ ایک دفعہ مولوی صاحب اس سے کسی بات پر بگڑ بیٹھے اور اُسے چیلنج دیدیا کہ دیکھ میں تجھے کس طرح سیدھا کرتا ہوں۔ جمعہ کی نماز میں مولوی صاحب نے اعلان کر دیا کہ یہ دُکاندار وہابی ہو گیا ہے اس لئے اس سے کوئی مسلمان خرید و فروخت نہ کرے۔ بس پھر کیا تھا چار ہی روز میں لالہ جی کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اس نے مولوی

لیبل

صاحب کو راضی کر لیا۔ دوسرے جمعہ میں مولوی صاحب نے اعلان کر دیا کہ اب خیر فضل ہے لالہ پھر دیوان ہندو ہو گیا ہے "وہابی" نہیں رہا۔ اب اسکا بائیکاٹ ختم ہو گیا۔ یہ ہے لیبل کا اثر۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں اس قسم کے لیبل وضع ہوتے چلے آئے ہیں آج اسی قسم کا ایک لیبل "منکرینِ حدیث" کا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ علم النفس کی رُو سے اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس لیبل کے وضع کرنے میں اس جذبۂ انتقام کا بھی بڑا ہاتھ دکھائی

Marfat.com

دے گا جو "وہابی" کے لیبل سے اس سے پیشتر پیدا ہو چکا تھا۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ میں قرآن کریم کو دین کی مکمل کتاب مانتا ہوں یعنی میرا ایمان ہے کہ یہ صحیفہ مقدس تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے، نجات و سعادت کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ اسی کتاب عظیم پر حضور سرورِ کائنات (صلعم) نے عمل کیا اور اسی کے مطابق اس حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہوا جس میں اللہ کے یہ قوانین انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے عملاً نافذ ہوتے تو چونکہ یہ آواز قوت و عمل کی طرف دعوت دینے والی آواز ہے۔ اس لئے سہل انگاری اور آرام طلبی نے فطرتی طور پر اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور اپنی عادت مستمرہ کے مطابق دلائل و براہین کے بجائے لیبل تراشی سے کام لیا۔ چنانچہ اس کے لئے "منکرِ حدیث" کا لیبل وضع کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا فلیتہ چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد خود پھر اسی میٹھی نیند میں سو گئے جس میں مدتوں سے سوتے چلے آرہے تھے۔ اس قسم کی "لیبل تراشی" جہاں ایک طرف ان لوگوں کے آرام و سکون (یعنی جمود و تعطل) میں خلل اندازی کے فتنے سے انہیں کچھ وقت کے لئے محفوظ کر دیتی ہے۔ دوسری طرف بہت سے بے علم مدعیانِ علم و دین کی جہالت کے لئے عارضی نقاب پوشی کا بھی کام دیتی ہے۔ کس قدر آسان ہے یہ کہہ دینا کہ یہ آواز اس لئے حق کی آواز نہیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس کے خلاف ہے!

Marfat.com

طلوعِ اسلام مسلمانوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے دین سے ہٹا کر اس دینِ فطرت کی طرف دعوت دینے کا مدعی ہے جو اللہ نے انسانوں کے لئے منتخب کیا اور نبی اکرمؐ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچا۔ چونکہ یہ آواز مدتوں کے آرام طلب اور سہل انگار مسلمان کی نیند میں خلل اندازی کا موجب تھی۔ اس لئے اس پر بھی ایک لیبل لگ جانا ضروری تھا۔ وہی لیبل جو آج کل "منکرِ حدیث" کے نام سے معروف ہے۔ اربابِ سیادت نے یہ لیبل لگایا اور پھر اپنی گہری نیند میں سو گئے اور عوام سے کہہ گئے کہ ہاں! ذرا ہوشیار رہنا۔ اس لیبل والا مسلمان بڑا خطرناک قسم کا ڈاکو ہوتا ہے۔ وہ تمہارے متاعِ ایمان وعقیدت کو جھپٹ کر لے جائے گا۔ اس کے قریب نہ پھٹکنا۔ ان اشتعال دلانے والوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو دل میں اپنے مسلک کی کمزوری کو جانتے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کا علانیہ اعتراف نہیں کر سکتے۔ کچھ حسد وعداوت کی بنا پر، کچھ عوام کی طرف سے جھوٹی عزت کی خاطر بعض اپنی سیادت کی مسند کو قائم رکھنے کے لئے۔ اور بعض معاش کی مجبوریوں کی وجہ سے۔

دلیل جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ بالکل نئی نئی باتیں ہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف میں تو کسی کے ہاں اس قسم کی باتیں دیکھی نہیں! حالانکہ اگر یہ لوگ کبھی غور وفکر

Marfat.com

کی ہمت کرتے تو ہو سکتا تھا کہ خود اسلاف میں بھی اس قسم کی باتیں مل جاتیں۔ اس لئے کہ انہی میں سے جنھوں نے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔ انھیں ایسی باتیں مل ہی گئیں۔ اسی قسم کی ایک مثال ہم آج پیش کر رہے ہیں۔ دنیائے مذہب میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں نہ ہی جناب عبید اللہ سندھی کا نام نامی۔ اوّل الذکر متقدمین میں اور ثانی الذکر متاخرین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب سندھی، حکمتِ ولی اللّٰہی کے بہت بڑے مفکّر اور مبلّغ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے شاہ ولی اللہؒ کے متعلق ایک بسیط مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا جو رسالہ الفرقان کے "ولی اللہ نمبر" میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کے متعلق شاہ صاحبؒ کے اہم خیالات پر مشتمل ہے۔ ہم اس مقالہ سے جستہ جستہ مقامات نقل کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ ان اصولی مباحث میں شاہ صاحبؒ اور جناب سندھیؒ کا مسلک کیا ہے۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم ان حضرات کے خیالات کو بطور سند نہیں پیش کر رہے، اسلاف اور اپنے ہم عصر حضرات کی پوری تعظیم و تکریم کے جذبات کے ساتھ ساتھ ہم اس حقیقت کا بھی اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک دین کے معاملہ میں کسی انسان کی رائے یا عقیدہ حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو رائے یا عقیدہ قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ قابلِ قبول ہوگا۔ ورنہ ہم کہہ دیں گے کہ ان حضرات نے غلط سمجھا۔ اسی اصول

Marfat.com

کا ہم اپنے اوپر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ ہماری جو بات کتاب اللہ کے خلاف ہو اسے آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی درخور اعتنا تصور نہ فرمایئے۔

جناب سندھیؒ صاحب نے مجولہ صدر مقالہ مختلف صحبتوں میں املا فرمایا اور ایک دوسرے صاحب نے اسے قلمبند کیا تھا۔ بنابریں مقالہ میں خاص طور پر ربط قائم نہیں رہ سکا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اقتباسات میں ربط ملحوظ رکھا جائے۔ نیز بعض مقامات پر تھوڑی بہت تشریح کی بھی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ جناب سندھی کے مقالہ کے اقتباسات واوین "ر......" میں درج کئے گئے ہیں۔ واوین سے باہر کی عبارت ہماری اپنی ہے۔ آپ ان اقتباسات کو غور و تعمق سے مطالعہ فرمایئے اور استیعاب کے لئے اصل مقالہ کی طرف رجوع کیجئے۔ واللہ المستعان۔

۱۔ فقہ اور قرآن

جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"فقہائے عظام نے قرآن عظیم کو اپنی اصولِ فقہ میں پہلے درجہ پر رکھا ہے مگر اس سے مراد ان کے یہاں چند آیاتِ احکام ہیں جو امر و نواہی کی شکل میں قرآن حکیم میں مدون ہیں اس تخصیص کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک عالم سارا قرآن سمجھنا ضروری نہیں جانتا۔ پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گو، افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آگئی اور فقہا کا اس میں دخل نہ رہا...... جن لوگوں نے یہ خیال بنایا تھا کہ فقیہ بننے کے لئے

قرآن کریم کے فقط اوامر و نواہی کافی ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ قرآن کو مس تک نہیں کر سکتے ۔ جب مسلمانوں کی مرکزی جماعت کا قرآن عظیم کے متعلق یہ خیال ہو تو عوام بیچارے اس بارے میں کہاں تک قابلِ ملامت قرار دیئے جا سکتے ہیں"۔ (صفحہ ۲۴۳ و صفحہ ۲۴۶)

یہ ان فقہا کی کیفیت تھی جنھوں نے فقہ کی تدوین کی ۔ بعد میں آنے والے حضرات نے قرآن کریم کی طرف اتنا سا رجوع بھی ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک دین، تمام وکمال فقہ کے اندر آچکا تھا جس میں کسی قسم کا تغیّر و تبدّل جائز نہ تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اور سب کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن قرآن پڑھانے کی ضرورت بالکل نہیں سمجھی جاتی ۔ قرآن کی تلاوت محض ثواب کی خاطر رہ گئی ہے ۔

۲۔ شانِ نزول | جناب سندھی فرماتے ہیں:۔

"ائمہ فقہا نے اپنے اصول میں بالاتفاق یہ مسئلہ درج کیا ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہے اور مفسّرین اس کا کوئی خاص واقعہ سبب بتاتے ہوں تو قرآن فہمی میں عموم الفاظ ہی مدنظر رہے گا خصوصیت محل کو اس میں دخل نہیں ہوگا ۔ اس قاعدے پر اتفاق کرتے ہوئے آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے ہر آیت کے ماتحت ایک جزئی واقعہ پائینگے

Marfat.com

مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے۔ یہ عبداللہ بن ابی منافق کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق کی فضیلت میں اتری۔ اس میں اہلِ بیت کے فضائل کا بیان ہے۔ عام اساتذہ اور طلبہ کو آپ انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔ شاہ صاحب نے "الفوزالکبیر" کی ابتدا میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور آیاتِ احکام کا مطلب یہ بتلایا کہ اجماعی طور پر انسانوں میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں موجود ہیں ان کو ان آیات کا سبب نزول سمجھنا چاہیے۔ عرب، یا عجم، زمانے کے تقدم یا تاخر سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔" (ص ۲۴۳)

یہ اس لئے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول، ایک زمان یا ایک مکان کے لئے نہیں بلکہ ہر ماحول، ہر زمان اور ہر مکان کے لئے ہے اور کسی شانِ نزول، موقعِ نزول یا واقعہ نزول کا پابند نہیں۔ وہ قیامت تک کے لئے دینی نصاب ہے اور ہر زمانے میں اس سے نئی روشنی لی جا سکتی ہے۔ اس لئے فہمِ قرآن کو کسی ایک زمانے سے وابستہ کر دینا بھی درست نہیں۔

۳۔ عقل اور قرآن

جناب سندھی فرماتے ہیں:۔

"عام مفسرین نے رُوح کے عِلم کو متشابہات میں داخل کر رکھا ہے۔ کوئی مفکر اس کے قریب

Marfat.com

نہیں جا سکا اس لئے تمام مسائل بعد الموت، تحت اللفظ ترجمہ پڑھنے سے زیادہ قابلِ غور نہیں سمجھے جاتے۔ یہاں تک کہ عقائد کی کتابوں میں توحید اور نبوّت کا مسئلہ تو عقلی مانا جاتا ہے اور عذاب القبر سے لے کر آگے کی تمام بحثیں نقلی سمجھی جاتی ہیں۔ عذاب القبر کو صرف اس لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی تالیفات میں مسلمانوں کو اس غلطی سے بچا لیا ہے۔ مابعد الموت جو زندگی قرآن ثابت کرتا ہے ان کے یہاں مسلسل عقلی نتائج کا مجمل بیان ہے۔ عقل صریح کی پوری تائید کے بغیر کوئی چیز قرآن منوانے کی خواہش نہیں رکھتا۔"

(ص ۴۶، ص ۲۴۵)

ہم اس مقام پر رُوح کے مسئلے میں اُلجھے بغیر اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے آپ کو نُور کہتا ہے۔ جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور اپنے اِرد گرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ وہ عقل کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے دعاوی بصیرت پر مبنی ہیں اس لئے جہالت اور توہم پرستی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ وہ سراپا حکمت ہے اور ہر صاحبِ بصیرت کو تفکر و تدبر کی بار بار دعوت دیتا ہے اس لئے جوں جوں انسانی علم و عقل ترقی کرتے جائیں گے۔ قرآنی غوامض بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔

جناب سندھی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "عذاب القبر کو صرف اِس

Marfat.com

لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے"۔ یہ بالکل درست ہے۔ قرآن کریم میں عذاب قبر کا کہیں ذکر نہیں۔

۴۔ متشابہات

جناب سندھی ارشاد فرماتے ہیں:۔

"قرآن حکیم نے آیات قرآنی کی تقسیم محکمات اور متشابہات میں کر دی ہے۔ عموماً اہلِ علم متشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ پھر متشابہات کی ایسی واضح تعریف وتفسیر جس سے تمام ایسی آیتیں تحقیقی اور تحدیدی طور سے جُدا کر لیجا سکیں کوئی متفقہ علیہ موجود نہیں ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک تو قرآن بتمامہ ناقابلِ فہم ہوگیا اور متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ مقرر ہو گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ بن جائے کہ اسکے بعض حصے (جس کا پورا تعین بھی نہیں) فہم سے بالاتر ہیں تو انسانی متوسط عقول کے لئے ساری کتاب مشتبہ بن جاتی ہے۔ طبیعت میں خدشات اور اوہام اٹھتے ہیں کہ فلاں فلاں آیت کا جو مفہوم ہم نے معین کیا ممکن ہے اس کی نقیض ان آیات میں موجود ہو جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس غلط فکر نے عمل کے لئے قرآن کی طرف سے مسلمانوں کے التفات کو یکسر ہٹا دیا ...... جو لوگ ان اصطلاحات کے پابند ہیں جن سے ان مسائل (تقدیر وغیرہ) پر غور کرنا کسی راسخ فی العلم کے لئے بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ (اور ان ہی سے مدارس

Marfat.com

مکاتب بھرے پڑے ہیں) میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس زمانے میں اسلام کے لئے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں"۔ (صفحہ ۲۵ و صفحہ ۲۵۵)

صرف متشابہات ہی نہیں بلکہ یہاں تو یہ حالت ہے کہ سارے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ پچھلی تفاسیر میں آچکا ہے۔ اس میں مزید تدبر و تفکر گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ ناسخ و منسوخ

جناب سندھی کا ارشاد ہے:

"قرآن عظیم میں فکری انتشار کا ایک اور باعث مسئلہ ناسخ و منسوخ کی بحث بھی ہے۔ اہلِ علم منسوخ آیات کو متفقہ طور پر محدود و محصور نہیں کرتے یعنی ایسی آیات کی تحدید میں وہ خود باہمی طور پر مختلف ہیں۔ اس کا اثر قرآن کریم پڑھنے والے پر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر عملی معاملہ (حکم) میں اس کے منسوخ ہونے کا شبہ پیدا کر کے اپنے آپ کو فارغ الذمہ بنا لیتا ہے...... شاہ صاحبؒ اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا بیان اس فصل میں حکیمانہ ہے۔ قوم کی عام حالت کو مدِنظر رکھ کر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی سعی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے اہلِ علم پانچسو آیتیں منسوخ مانتے رہے لیکن شیخ جلال الدین سیوطی اتقان میں بیس سے زیادہ آیتیں منسوخ تسلیم نہیں کرتے..... شاہ صاحبؒ مذکورۃ بالا بیس آیتوں میں بھی تطبیق دے کر پانچ آیتوں

Marfat.com

یں تطبیق دے کر نسخ کو پانچ آیتوں میں منحصر کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ جس شخص نے ان پندرہ آیتوں کی تطبیق غور سے پڑھی وہ باقی ماندہ پانچ آیتوں میں بھی بآسانی تطبیق دے سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ صراحتہً یہ نہیں کہتے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت منسوخ نہیں اور وہ اس طرح صراحتہً لکھتے تو بعض معتزلہ کے قول سے تشابہہ ہو جاتا اور عام اہلِ علم اس پر غور کرنا ہی چھوڑ دیتے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مشکل آیتوں کو تو انھوں نے حل کر دیا اور نہایت آسان آیات میں نسخ مان لیا۔ اگر اسلوبِ حکیمانہ پر ان کے بیان کو حمل کیا جائے تو ہمارا مذکورۃ بالا نتیجہ اخذ کرنا بعید نہ ہوگا۔" (ص ۵۶-۲۵۵)

قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جس بِنا پر صراحتہً ایسا نہیں لکھا۔ وہ دوسرے الفاظ میں وہی ہے جسے ہم نے شروع میں "لیبل" سے تعبیر کیا ہے۔

۶۔ تفاسیرِ قرآن

جناب سندھی مختلف (مشہور و معروف) تفاسیر کے تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ

"ان سے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق سوائے تحیّر کے کچھ نصیب نہیں ہوا ...... ہم مانتے ہیں کہ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے انہی کتابوں سے قرآن سمجھا تھا۔ جب وہ قرآن کی حکومت مجتہدانہ طور پر قائم کر رہے تھے مگر اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی

Marfat.com

ہمارے لئے ناممکن ہے۔" (ص۲۴)

اس سے آگے حاشیہ میں مذکور ہے۔

"دورِ حاضر کے طلباء اور علماء کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ کتاب الٰہی کی تعلیم کے وقت متن کو چھوڑ کر شروح (تفاسیر) پر زور دیتے ہیں اور فن حدیث میں صحاح کی شرح حجۃ اللہ البالغہ سے پوری پوری غفلت برت کر صرف متون پر اکتفا کرنا شعار بنالیا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں غیر طبعی ہیں" (ص۲۵)

قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس کے لئے کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں۔ ہماری تفاسیر دراصل قرآن فہمی کی تاریخ ہیں۔ یعنی ان سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ فلاں فلاں دور میں قرآن کریم کس طرح سمجھا گیا۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن ہی سے ہوسکے گی۔ یہی وہ اصول ہے جس پر جناب پرویز نے اپنی کتاب معارف القرآن کو ترتیب دیا ہے جو قرآن کو قرآن ہی کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔

۷۔ مکمل کتاب

جناب سندھی رقمطراز ہیں:۔

"اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے متنِ قرآن کی حقیقت اپنے اشراق سے اس طرح معین کرلی کہ یہ کتاب بذاتِ خود ایک کامل مکمل نصاب ہے اس پر اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں۔" (ص۲۴۹)

Marfat.com

یہ ہے وہ سب سے بڑا الزام جو ہمارے خلاف عائد کیا جاتا ہے یعنی ہم قرآن کریم کو مکمل کتاب کیوں مانتے ہیں اور اس میں کسی اضافہ کی ضرورت کیوں نہیں سمجھتے! ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ قرآن رسول اللہؐ کی وساطت سے اُمت کو ملا۔ یہ حضورؐ کا منصب رسالت تھا۔ قرآن کا منشا یہ ہے کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم ہو۔ یعنی قرآن کا قانون دنیا میں عملی طور پر نافذ ہو۔ امت تک قرآن پہنچانے کے ساتھ ساتھ حضورؐ پر حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا فریضہ بھی عائد ہوا۔ اور یہ ایک بالکل فطری شے تھی۔ قرآن کاغذوں میں لکھے جانے اور زبان سے دُہرائے جانے کے لئے نہیں نازل ہوا تھا بلکہ دنیا میں ایک نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے نازل ہوا تھا۔ یہ نظامِ زندگی سب سے پہلے حضورؐ کے عہدِ سعادت میں قائم ہوا اور خلافت راشدہ تک جاری رہا، اس میں قرآن کریم قانونِ اساسی تھا۔ کوئی چیز اس سے باہر نہ تھی، اسی کی روشنی میں جزئی معاملات کے لئے فرعی قوانین مرتب ہوتے تھے اس کے بعد یہ سلسلہ گم ہو گیا اب (بتوفیق ایزدی) جس وقت پھر وہی نظام قائم ہوگا۔ اس میں قرآن قانون اساسی کی حیثیت رکھے گا اور دَورِ اولیٰ کے فرعی قوانین، دورِ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ یہ ہے دین کی عملی شکل، ملاحظہ فرمائیے کہ اس باب میں جناب سندھی کا کیا ارشاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

Marfat.com

۸۔ قرآن و سُنّت و اجماع

"عامِ اہلِ علم قرآن شریف کے ساتھ سنّت اور اجماع کو ادلّہ شرعیہ (یعنی دینی حجت۔ طلوع اسلام) میں شمار کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ سنّت کو قرآن سے مستنبط چیز مانتے ہیں لیکن اس استنباط کا طریقہ وہ نہیں ہے جو ائمہ فقہا میں مروّج ہے۔ بلکہ حکمت کے اصول پر استنباط کرنے کے طریقے اور ان کے اصول شاہ صاحب کے یہاں علیحدہ منفرد ہیں خیر کثیر میں اس مسئلہ کی انھوں نے تفصیل لکھ دی ہے۔ اس طرح پر اگر سُنّت کو مانا جائے تو قرآن کے استقلال پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔ رسول اللہ (صلعم) کے عہد سے خلافتِ راشدہ کے آخری وقت تک یعنی شہادت حضرت عثمانؓ (۳۵ھ) تک شاہ صاحب کی تحقیق میں مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ اس دور کو وہ دورِ اجماع کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالۃ الخفاء میں مذکور ہے۔ شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد اختلاف شروع ہوا۔ اب اجماع وہی مستند ہوگا جو مذکورہ دورِ اوّل کے تتبع[۱] میں منعقد ہو۔ شاہ صاحبؒ اس دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالۃ الخفاء میں موجود ہے۔ اسے ساری دنیا جانتی ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کا مستند سوائے قرآن عظیم کے کوئی لکھی ہوئی

---

[۱] یعنی قرآنی حکومت کا قیام ہو اور اس میں مسلمانوں کی مرکزی جماعت جزئی قوانین مرتب کرے۔ (طلوع اسلام)

Marfat.com

چیز نہ تھی۔ اس پر یہ جماعت اپنے پارٹی پالیٹکس کے نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمل کرتی تھی۔ اس پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن حکیم کی ذیل کی آیت ہیں: اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ رسول اللہؐ کی صحبت اور تعلیم سے جو جماعت قرآن پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوئی۔ اس کا وہ مرکزی حصہ جس کا ہر قول وفعل خدائے تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ وہ مہاجرین اور انصار کا پہلا طبقہ تھا۔ اس کی اتباع قرآن پر عمل کرنے کے لئے قیامت تک مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ (یعنی قرآن کے اصولوں میں نہ کہ فرعی قوانین میں جن کے متعلق خود جناب سندھی نے اگلی سطروں میں فرمایا ہے کہ وہ ہر زمانے میں قابلِ تغیر ہو سکتے ہیں۔ طلوع اسلام) زمانے کے تغیرات سے جو نئی چیز قابلِ بحث پیش آئے وہاں اس جماعتِ متبعین بالاحسان کا فیصلہ ماننا ضروری ہوگا (یعنی ہر دور میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے والی جماعت کی سنٹرل کمیٹی۔ طلوع اسلام)، یہ اس دور کے مابعد کے اجماع کا حاصل ہے۔ اس طرح اجماع قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے متفقہ فیصلے یا اغلبیت کے فیصلوں کا نام ہوگا۔ لہٰذا اجماع قرآن سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ اجماعیات قرآنی اصول کے تشریحی بائیلاز ہوں گے۔ اس سے کوئی ترقی کن جماعت جو

Marfat.com

زمانہ کے طویل عرصہ میں کام کرے۔ خالی نہیں ہوسکتی۔ اس طرح اجماع بھی قرآن کے مقابل ایک مستقل اصل نہ بنا بلکہ قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے اتفاق کا نام ہوا۔ اس طور سے مسلمانوں میں قرآن کے مستقل درجہ کا تعارف کرانے والی شخصیت امام ولی اللہ دہلوی ہیں"۔ (صـ۲۶۳-۲۶۲)

اسی چیز کو جناب سندھی نے حاشیہ میں اور بھی واضح فرما دیا ہے۔ اقتباس سے پیشتر (عام قارئین کے سمجھنے کے لئے) ایک بات تمہیداً لکھ دینا ضروری ہے۔ متشدد فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا وہ وحی (یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ) ہے اس کا ایک حصہ قرآن ہے اور دوسرا حصہ احادیث۔ اس کی سند میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" (یعنی یہ رسول اپنی ذاتی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ یہ تو وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے) حالانکہ اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ قرآن ایک وحی ہے جو حضورؐ پر نازل کی گئی ہے۔ حضورؐ اسے اپنی طرف سے وضع کر کے (معاذ اللہ) پیش نہیں کر رہے۔ اس کے بعد جناب سندھی کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"علمائے اصولِ فقہ لکھتے ہیں کہ اصولِ دین چار ہیں۔ کتاب و سنّت و اجماع و قیاس۔ درحقیقت یہ تعبیر صحیح نہیں۔ کیونکہ قیاس

Marfat.com

تو وہی معتبر ہے جو اصولِ ثلاثہ سے مستنبط ہو۔ باقی رہے تین اصول، سو ہمیں بڑی محنت کے بعد معلوم ہوا کہ ساری سُنّت قرآن سے مستنبط ہے۔ خیر کثیر ص۱۵ میں اس کی تصریح موجود ہے (یعنی قرآن سے باہر سُنّت کہیں نہیں ہے۔ طلوع اسلام)، پھر آنحضرت صلعم اور خلفائے ثلاثہ کے متفقہ فیصلہ کے بغیر کوئی عمل مستند نہیں ہے (یعنی اُس دور میں اجماع انہی کے متفقہ فیصلوں کا نام تھا۔ طلوع اسلام) کیونکہ حضرت علیؓ کے عہد میں خیر الامم سے مشورہ کا جوہر کھو گیا تھا۔ لہٰذا اجماع کا مدار بھی کتاب وسُنّت پر ہوا۔ بناء علیہ اصل ہے فقط کتاب اللہ۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ ای ما ینطق بالقرآن عن الھوٰی۔ ہمارا رسول دین کے معاملہ میں کوئی ہوٰی کی بات نہیں کہتا۔ ذاتی خواہش کو اس میں کچھ دخل نہیں اور دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ یہاں! ینطق سے مطلق نطق (یعنی رسول اللہ کی ہر ایک بات طلوع اسلام) مراد رکھ کر وحی متلو اور غیر متلو کو ملا دیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ پسندیدہ نہیں بلکہ مطلق نطق بالقرآن (یعنی قرآن کی بات۔ طلوع اسلام) مراد ہے"

اُوپر کی عبارت چونکہ زیادہ واضح نہیں اس لئے اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ جناب سندھی کے نزدیک (یعنی شاہ صاحبؒ کی تعلیم کے مطابق) قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کے فیصلے (سُنّت) ناقابلِ تغیر ہیں اور انھیں اسی شکل میں قائم رکھنا۔ اسی طرح ان کی اِتّباع کرنا ضروری ہے۔ ذیل کی

Marfat.com

تشریح میں جناب سندھی نے اپنے مفہوم کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرما دیا ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں :-

"واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بناتے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدّل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلعم اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں ...... سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے ...... اصل قانون اساسی متعیّن ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے اِس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا۔ اور اس کا نام فقہ ہے" (ص ۲۱۴)

یعنی رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں باہمی مشاورت سے قرآن کریم کی روشنی میں جو تمہیدی قوانین (بائیلاز) مرتب فرمائے ان کا نام سنت ہے۔ یعنی اُس زمانے کی فقہ۔ یہ بائیلاز ہر زمانہ

Marfat.com

ہیں بدلتے رہیں گے لیکن اصل قانون (قرآن کریم) اپنی جگہ پر قانون اساسی کی حیثیت سے مستقل رہے گا:۔

قرآن اور حدیث

جناب سندھی کی مذکورہ صدر تصریحات کے بعد حدیث کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے لیکن طریقہ جمع و تالیف کی رُو سے احادیث کے مجموعوں کی کیا حیثیت ہے! اس کے متعلق وہ مزید وضاحت فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ:۔

"سورۃ النجم کی آیت ان ھو الا وحی یوحیٰ کی دو طرح کی تفسیر کی جاتی ہے۔

(۱) شاہ صاحبؒ کے طریقے پر تحقیق یہ ہے کہ ضمیر ہو قرآن کی طرف راجع ہے اور مَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی میں بھی نطق قرآنی کے متعلق بحث ہے۔

(۲) مگر اہل علم کی دوسری جماعت اس آیت کو قرآن سے مخصوص نہیں مانتی اور رسول اللہ صلعم کے تمام اقوال کو ایک طرح کی وحی ثابت کرنے پر زور دیتی ہے۔ ان کے نزدیک وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی قرآنی نقل سے مقید نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلعم کا ہر قول وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی میں داخل ہے اور اسی کو اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحیٰ میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) ان حضرات کے نزدیک حدیث کی اصل بھی وحی ہی سے ثابت ہے

Marfat.com

نفظ الفاظ کا فرق ہے۔ قرآنی الفاظ وحی سے متعین ہوتے اور حدیث کے الفاظ رسول اللہ صلعم کے اپنے طبعی ملکہ سے صادر ہوئے ہیں مگر معنیٰ سب کے سب وحی ہیں)۔

(۲) پھر ان کے نزدیک یہ فرق بھی موجود ہے کہ قرآن خود رسول اللہ صلعم کے سامنے ایک مصحف میں کتابتہً محفوظ کر دیا گیا اور اس کی روایت بالتواتر قائم رہی لیکن حدیث میں جو وحی آئی ان کے نزدیک بھی نہ تو حضورؐ کے زمانے میں اس کی کتابت ہوئی اور نہ اس کے لئے تواتر ضروری ہے۔

ان لوگوں کی اصطلاح پر اگر کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کا درجہ دیا جائے تو بطریق اولیٰ اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہتے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کر لیں تو تمام اشکال حل ہو جائیں۔(۱) ہماری کتب حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں۔ (۲) نیز ان کتب حدیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ (۳) ہماری بہت سی کتب حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین، ابوداؤد، ترمذی) کے درجہ پر رکھ دیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔" (ص ۲۶۶-۶۷)

یعنی وحی تمام کی تمام قرآن کریم کے اندر محصور ہو چکی ہے اس کے باہر کہیں نہیں پھر جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے

Marfat.com

آپؐ کی سیرت لکھی جس میں آپؐ کے اقوال واعمال کو اپنی انفرادی کوشش سے جمع کیا اسی طرح مسلمان ائمہ تاریخ وروایات نے نبی اکرمؐ کی سیرت اور حضورؐ کے عہد مبارک کی تاریخ مدوّن کی۔ تاریخ وسیرت کی ان کتابوں کا نام جو اس طرح کی روایات پر مشتمل ہیں، کتب احادیث ہے۔ نہ یہ وحی ہیں، نہ وحی (قرآن) کی طرح محفوظ اور اس لئے یقینی نہیں ہیں، جس طرح کتب اناجیل یقینی نہیں ہیں۔ جناب سندھی کے مضمون کے حاشیہ میں خود شاہ صاحبؒ کی عبارت درج ہے۔ جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: (عبارت فارسی میں ہے)

"کتاب الٰہی کے لئے دو چیزیں لازم ہیں۔ اوّل ملکوت کی برکتیں اور ملاء اعلیٰ کی خوشنودگی اور پسندیدگی ہر اس شخص کے لئے جو کتاب کی تلاوت کرے اور اس کی اشاعت میں کوشش کرے دوسرے طویل زمانوں کے گذر جانے پر بھی اس کتاب کا باقی رہنا اور امت کے لئے اس کے حفظ کرنے کی توفیق حاصل ہونا۔ اگر یہ دو باتیں نہ پائی جائیں تو وہ کتاب کتاب الٰہی نہ ہوگی بلکہ انسانوں میں سے کسی فرد کی تالیف ہوگی۔ جس نے اپنے ارادے سے علم پیغمبر کو جمع کیا۔ جیسے ہمارے دین میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں" (صٓ ۲۶۵)

جناب سندھی کے الفاظ میں "اس طرح انبیاء کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانے میں بھی رائج رہا ہے" (صٓ ۲۶۵) لہٰذا کتب احادیث

Marfat.com

درحقیقت کتب تاریخ ہیں۔ اور کتب تاریخ میں ہر طرح کی روایات درج ہوتی ہیں۔

صحاح ستہ میں غلط روایات کا اختلاط

چنانچہ جناب سندھی فرماتے ہیں:۔

"میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمۂ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی۔" (صفحہ ۲۶۸)

ضعیف روایات متواتر کیسے بن جاتی ہیں

جناب سندھی مختلف طبقات کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ان کے سوا بعض ایسے محدثوں نے بھی کتابیں تصنیف کیں جن کی لیاقتِ علمی بھی مسلّم نہیں ہے۔ متاخرین محدثین نے ..... ان غیر معتبر کتابوں کی روایتیں زوائد کے نام سے جمع کر دیں جس سے علم حدیث میں فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ اس ذخیرہ میں کافی سے زیادہ روایتیں ایسی موجود ہیں جن کو دوسرے طبقہ کا مصنف ضعیف قرار دیتا ہے اور ان طبقات (یعنی تیسرے چوتھے اور

Marfat.com

پانچویں) میں پہنچکر ان متاخرین کے نزدیک وہ حدیث متواتر بن جاتی ہے۔"

اس کے بعد آپ نے ایک حدیث کی مثال دے کر لکھا ہے:۔

"ترمذی نے اس حدیث کی تضعیف کردی۔ اب مستدرک حاکم کو دیکھئے۔ وہ اس جملہ مضاعفہ کو تیس چالیس سندوں سے روایت کرتا ہے۔ ایک غیر محقق عالم اس کثرتِ اسانید سے متاثر ہو کر اس کی صحت یا اس کے درجہ شہرت اور تواتر پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ہم نے حاکم کی ان روایات کی تنقید فتح الباری کی امداد سے شروع کی تو ان میں سے ایک اسناد بھی صحیح نہ نکلی۔" (ص ۲۷۵)

صحیح بخاری کی ضعیف روایات

اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"تھوڑی تھوڑی غلطیاں ہر مصنف سے ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ امام بخاری جو سب سے زیادہ متقن مانے جاتے ہیں ان کی کتاب میں حافظ ابن حجر چالیس کے قریب ایسی احادیث مانتے ہیں جن کی اسانید ضعیف ہیں اور حافظ صاحب کے پاس بھی ان کا کوئی حل نہیں"۔ (ص ۲۷۶) حاشیہ میں ہے "یوں تو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری میں سو کے قریب معلل روایتیں نکالی ہیں پھر ان خدشات کے جوابات بھی بیان کئے ہیں مگر چالیس کے قریب روایات کا ضعف ان کے نزدیک اس درجہ کا ہے، کہ باعترافِ حافظ اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا"۔

صحیح اور ضعیف احادیث کا معیار

متشدد فی الحدیث

Marfat.com

طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ موجودہ مجموعہ احادیث میں حدیثوں کی جو تقسیم ہو چکی ہے وہ اٹل ہے۔ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ جسے صحیح قرار دیا جا چکا ہے وہ صحیح، جسے ضعیف کہہ دیا گیا ہے وہ ضعیف، یعنی اسے تقلیداً ماننا پڑے گا۔ قرآن کریم کی روشنی میں اپنی سمجھ سے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

جناب سندھی فرماتے ہیں:۔

"یہ خرابی جو عام اذہان پر مستولی ہے اس کی تہ میں یہ مرض پنہاں ہے کہ حدیث کے فن کو خصوصاً تصحیح اور تضعیف کو تقلیداً اخذ کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا عالم جو اپنی سمجھ سے صحیح حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہو آج پیدا ہونا متعذر ہو گیا ہے۔[۱] اسماء الرجال میں توثیق و تضعیف کا اختلاف پھر صحیح حدیث کی تعریف میں مختلف آرا، طالب العلم میں یکسوئی سے کوئی ملکہ پیدا ہونے نہیں دیتیں۔ آخر مجبور ہو کر فقہا کا جو متوارث مسلک ہے اسی میں راجح و مرجوح کی تمیز پیدا کرنے کے بعد، جو حدیث اس مسلک کے موافق ہو اسے صحیح اور جو مخالف ہو اس کو ضعیف بنانے کی استعداد حاصل ہونے پر طالب العلم اپنا سفر ختم کر دیتا ہے۔" (ص ۲۷۹)

اور اس کے بعد دین کا واحد ٹھیکہ دار بن جاتا ہے جسے چاہے مسلمان سمجھے جسے چاہے کافر قرار دیدے۔

صحیح بخاری کی بعض احادیث

جیسا کہ طلوع اسلام کے صفحات پر کئی مرتبہ آ چکا ہے۔ ہماری کتب احادیث میں ایسی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کرتے ہوئے

۱؎ جو اس کا دعویٰ کرتے ہیں ان پر کفر کے فتوے عائد کر دیتے جاتے ہیں۔

Marfat.com

دل کانپ اٹھتا ہے۔ ان مقامات کی تصریح سے ہم مجتنب رہے ہیں اس لئے کہ ان کا ذکر کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ دیکھئے! جناب سندھی اس باب میں کیا فرماتے ہیں:-

"جس قدر میری توجہ قرآن کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔ میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوا کہ دینی تعلیم اگر عربی مدارس کے طلبا کو دی جائے تو اطمینان بخش ہو اور اگر وہی تعلیم کالج کے طلباء کو دی جائے تو اطمینان پیدا نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہو تو وہ تعلیم حقیقی اسلام کی تعلیم نہیں ہوگی اس لئے کہ قرآن ساری دنیا کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگر کالج کے طلبا کو ہم قرآن کی تعلیم اس طریقے پر (جو عربی مدارس میں کامیاب ثابت ہو) نہیں دے سکتے تو غیر مسلم لوگوں کو ہم کیا پڑھا سکتے ہیں .... رہا یہ کہ بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نومسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ اہلِ علم جو تکمیل کر چکے ہیں۔ یا تکمیل کے قریب ہیں۔ ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہہ دوں گا۔" (ص ۲۸۷-۲۸۵)

مرکزیت

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مولانا سندھی کے نزدیک قرآنی اصول غیر متبدل ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ بائیلاز ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بائیلاز میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا حق کیسے حاصل ہوگا؟ ظاہر ہے

Marfat.com

کہ اس کا حق "حکومتِ الٰہیہ کی مرکزی جماعت کو ہو گا۔ جناب سندھی فرماتے ہیں:-

"اس کے بعد میرے دماغ پر یہ اثر پیدا ہوا کہ قرآن عظیم دنیا کی تمام اقوام میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام ہے۔۔۔۔۔ اگر قرآن عظیم کی تعلیم کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام مان لیا جائے تو اس کے لئے تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔ (الف) اس کا آئیڈیا (ب) اس کا پروگرام (ج) اس پروگرام کو چلانے والی سنٹرل کمیٹی۔ کوئی انقلابی تحریک، پارٹی پالیٹکس کے سوا کامیاب نہیں ہوتی۔ اور ہر پارٹی پالیٹکس میں ان تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔

(۱) میں نے قرآن عظیم میں غور کر کے اس کا آئیڈیا اس آیت کو مقرر کیا: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ[۱]

(۲) پروگرام کے لئے پہلے حزب اللہ کی تعیین و تحدید ضروری ہے حزب اللہ اس پارٹی کا نام ہے جو قرآن حکیم کے انٹرنیشنل پروگرام کو کامیاب بنانا اپنا مقصدِ حیات قرار دیتی ہے۔ حزب اللہ کی ضروریات پر قرآن عظیم کی مختلف سورتوں میں کافی ہدایتیں دی گئی ہیں جہاں جہاں یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وغیرہ سے مومنین کو خطاب کیا گیا کہ

---

[۱] اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حقہ کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ دین تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب آجائے۔ خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

Marfat.com

وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں بلکہ فلاں فلاں حکم کی اس اس طرح پابندی کریں۔ ان تمام مواقع کو حزب اللہ کا پروگرام سمجھنا چاہئے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے پہلے مخاطب حزب اللہ کے افراد ہی ہوتے ہیں۔ اس میں مرد و عورت، عرب و عجم سب شامل ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ اور ان کے بعد (وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ) قیامت تک کی جمیع اقوام مسلمہ کو شامل ہے۔ اس طرح یہ پروگرام قیامت تک جاری رہے گا۔" (ص ۲۹۴)

تصریحاتِ بالا پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ طلوع اسلام گذشتہ چار برس سے کس مسلک کی طرف دعوت دیتا چلا آ رہا ہے؟ جو کچھ گذشتہ اوراق میں درج کیا گیا ہے اس کا ملخص یہی ہے کہ

(۱) قرآن کریم مکمل کتاب ہے اور اپنی تفسیر میں کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں (۲) دین قرآن کریم کے اندر محصور ہے (۳) نبی اکرمؐ کا ایک فریضہ تبلیغ رسالت (یعنی انسانوں تک قرآن کا پہنچانا) تھا، اور دوسرا فریضہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام (۴) حکومتِ الٰہیہ میں معاملات کے فیصلے قرآن کے قانونِ اساسی کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ قانونِ اساسی متعین اور غیر متبدل ہے لیکن اس کی روشنی میں مرتب شدہ فروعی قوانین (بائیلاز) زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ (۵) فروعی قوانین کی ترتیب و

Marfat.com

تدوین حکومتِ الٰہیہ کے ارباب حل وعقد کی مرکزی جماعت کا فریضہ ہے جسے قیامت تک جاری رہنا چاہئے تھا۔ (۶) خلافتِ راشدہ کے بعد یہ نظام برہم ہوگیا اور دین میں انفرادیت اور ملوکیت آگئی۔ (۷) اب پھر دین کو اپنی اصلی شکل میں قائم کرنے کے لئے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی ضرورت ہے جس میں قانونِ اساسی قرآن کریم ہوگا اور تمہیدی قوانین (بائیلاز) قرآن کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق مرتب کئے جائیں گے اس میں قرونِ اولیٰ کے فقہ (بائیلاز) سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے اس طرح اُمت کے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔ (۸) کتب احادیث۔ تاریخ کی ان کتابوں کا نام ہے جن میں عہد نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ کے احوال وکوائف درج ہیں۔ یہ انسانوں کی انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے اس لئے ظن وتخمین اور شک وشبہ سے بلند نہیں ہے نہ ہی تنقید سے بالا۔ جس طرح کتبِ اناجیل وغیرہ احادیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ جو احادیث اس معیار پر پوری اُتریں۔ ان سے ہم اپنے زمانہ کے بائیلاز مرتب کرنے میں مدد لے سکتے ہیں۔ (۹) نبی اکرمؐ کا منصبِ رسالت 'پیغمبری' حضورؐ کی ذات گرامی تک ختم ہوگیا۔ اب کوئی نبی اور رسول نہیں آسکتا۔ لیکن منصب امامت (حکومتِ الٰہیہ کا قیام و بقا) خلافتِ راشدہ میں منتقل ہوگیا اگر وہ نظام قائم رہتا تو یہ منصب آج تک جاری رہتا۔ اس منصب کے احیاء میں ہی اصل دین کے احیاء کا راز مضمر ہے:

Marfat.com

تین بڑے بڑے منکرینِ حدیث

امام ابوحنیفہؒ، شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ

علّامہ اقبالؒ نے (خطباتِ تشکیلِ جدید میں) اپنے چھٹے خطبہ کا عنوان رکھا ہے "اسلامی نظام میں اصولِ حرکت" اس میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام ایک تحریک ہے اور تحریک کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی خاص زمان یا مکان کے ساتھ مخصوص اور اس کی چاردیواری میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس باب میں انھوں نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے غیر متبدل سرچشمہ قرآنی قوانین ہیں ہے اور احادیث سے مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ نے اپنے زمانے کے لئے ان اصولوں کی تفصیل کس طرح مرتب فرمائی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

> "احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے۔

Marfat.com

کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم ورواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم ورواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات، واطوار اور رسوم ورواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انھیں آنے والی

Marfat.com

نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات اقبال صفحہ ۱۶۴-۱۶۳)

طلوع اسلام اسی مسلک کی دعوت دینے کے جرم میں "منکرِ حدیث" فلہٰذا "مرتد اور ملحد" قرار دیا جا رہا ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ اس معاملے میں کتنے کتنے بڑے "منکرینِ حدیث" اس کے ساتھ شامل ہیں۔

Marfat.com

ہمارا جُرم

(نوشتہ جنوری ۱۹۴۷ء)

قرآن کریم انسانوں کی فکر و عمل کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے آیا تھا۔ ان لوگوں کی طرف سے جو اس انقلاب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی مخالفت ضروری تھی وہ ہر قسم کی مخالفت کرتے تھے لیکن قرآن کا یہ اعجاز تھا کہ اگر کسی ایسے شخص کے کان میں جو تعصّب کو الگ رکھ کر فہم و فراست سے کام لے اس کی ایک آیت بھی پڑ گئی طبع سلیم اسے قبول کرنے پر فوراً آمادہ ہو گئی۔ اس لئے مخالفین کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ قرآن کے الفاظ کسی کے کان میں پڑنے ہی نہ پائیں۔ چنانچہ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ ۲۶/۴۱

اور کفار کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اور اس پر شور مچاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ۔

یعنی وہ کامیابی اس میں سمجھتے تھے کہ قرآن کریم میں شور مچا دیا جائے تاکہ نہ کوئی اسے سُنے نہ کسی پر اس کا اثر ہو، یعنی قرآن کریم کے دلائل و شواہد کے

Marfat.com

سامنے وہ عملاً اپنی شکست تسلیم کرتے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ دلائل وحجت سے ہم اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس کی مخالفت کا ایک ہی طریقہ کارگر ہو سکتا ہے یعنی کوئی اسے سننے ہی نہ پاتے۔ اسے کسی تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔

کفار قرآن کریم کی مخالفت کیوں کرتے تھے! اس لئے کہ قرآن کریم ان کی اس روشِ زندگی کو جھٹلاتا تھا جس پر وہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید سے چلے آرہے تھے اور اس روش کو علم وبصیرت کی روشنی میں پرکھتے نہیں تھے اور نیز اس لئے کہ قرآنی نظامِ زندگی میں ان کی اپنی سیادت وامارت ختم ہو جاتی تھی۔ اگر وہ دنیاوی اقتدار کی مسندوں پر متمکن تھے تو انھیں ان کے چھن جانے کا خوف تھا اور اگر دینی گدیوں پر مستولی تھے تو ان کے کھو جانے کا بھی خطرہ تھا۔ موہوم خوف وخطر نہیں بلکہ یقینی خطرہ۔ قرآن کے سامنے ملوکیت اور برہمنیت دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کفار کی وہ روش جس کا ذکر اوپر کی آیت جلیلہ میں آیا ہے۔ کچھ عہدِ رسالتمآب صؐ کے کفار کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ دنیا میں جب تک اور جہاں جہاں کفر وایمان کی آویزش اور حق وباطل کی کشمکش موجود ہے۔ مخالفین قرآن کریم کا یہ اندازِ مخالفت بھی موجود ہے اور موجود رہے گا۔ "شور مچانے" کے طریقے بدل سکتے ہیں۔ لوگوں کو قرآن کے پاس جانے سے روکنے کی تدابیر

Marfat.com

کی شکلیں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ لیکن مخالفت کی یہ رُوح ہمیشہ موجود رہے گی۔ اس لئے کہ ہر مخالف پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ وہ دلائل و براہین سے قرآن کے مقابلہ میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے قرآن کا یہ چیلنج یاد ہے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ؕ اگر سچے ہو تو اپنے دلائل پیش کرو۔ اس لئے قرآن کریم کی مخالفت کا ایک ہی طریق ہے کہ لوگوں کو اس کے پاس آنے سے روکو۔ اس کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچنے دو۔

قرآن کی مخالفت

یہاں تک تو ہم نہایت فخر اور بے باکی سے لکھتے چلے آئے لیکن اس کے بعد جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں اس کے تصوّر سے ہماری رُوح کانپتی ہے۔ ہاتھ میں قلم لرزتا ہے اور ندامت سے آنکھیں زمین میں گڑی جا رہی ہیں۔ اس لئے کہ اس سے پیشتر تو قرآن کی اس مخالفت کا تذکرہ تھا جو کفّار کی طرف سے کی جاتی تھی۔ لیکن اب قرآن کی اس مخالفت کا ذکر آ رہا ہے جو کفّار کی طرف سے نہیں بلکہ (پناہ بخدا) خود ان کی طرف سے ہوئی اور ہو رہی ہے جو قرآن پر ایمان کے مدعی ہیں اور ندامت کے ساتھ حیرت کہ اس مخالفت میں طریق بھی وہی اختیار کیا جاتا ہے جو مذکورۃ صدر آیت مقدسہ میں بیان کیا گیا ہے یعنی لوگوں کو قرآن تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ شور مچا دیا جائے۔

Marfat.com

یا للعجب! قرآن پر ایمان کے مدعیوں کی طرف سے قرآن کی ایسی مخالفت کس بنا پر؟ اسی بنا پر جس پر قرآن نہ ماننے والوں کی طرف سے مخالفت ہوئی! یعنی قرآن کا یہ تقاضا ہے کہ آبا و اجداد کی طرف سے جو روشِ زندگی وراثت ملی ہے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھو اور نیز اس لئے کہ قرآن آجانے سے ان کی ملوکیت اور براہمنیت کے اقتدار چھن جاتے ہیں۔ یہی خوف قرآن کو نہ ماننے والوں کے دل میں جاگزیں ہوا اور انہوں نے مخالفت شروع کر دی۔ یہی خطرہ قرآن پر زبانی ایمان رکھنے والوں کو لاحق ہوا اور انہوں نے مخالفت شروع کر دی۔ نہ ماننے والوں کی مخالفت بھی آج تک جاری ہے اور ایسا ماننے والوں کی بھی، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے لوگوں کو قرآن سے باز رکھنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی گئی ہیں، ان کی شکلیں بدلتی رہی ہیں لیکن روح ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں ؛؛ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

غیروں کی طرف سے جس جس رنگ میں مخالفت ہوتی، اس کے ذکر کو چھوڑو کہ ان پر گلہ کیا! اپنوں کی طرف سے جو مخالفتیں ہوئیں ذرا انھیں نگاہ میں رکھو اور پھر دیکھو کہ کیا غیروں کی مخالفت اتنا نقصان پہنچا سکتی تھی جتنا اپنوں کی مخالفت پہنچاتی، اور پہنچا رہی ہے۔ اس مخالفت کی تفصیلات اپنی صدیوں کی تاریخ کے اوراق پر پڑھئے اور خون کے آنسو روئیے۔ اور

Marfat.com

اگر اتنی فرصت نہ ہو تو کم از کم "ارمغانِ حجاز" (اقبال) میں ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کی روئداد ہی دیکھئے اور غور کیجئے کہ مسلمان کو قرآن سے دُور رکھنے کے لئے کس کس مقدّس تدبیر سے کام لیا گیا۔ یہ سب کس لئے؟ محض اس لئے کہ دین و دنیا کی گدّیوں کے اجارہ داروں کی سیاست کا طلسم نہ ٹوٹنے پائے۔

یہ قصّہ ماضی تھا۔ لیکن آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ کیا آج مخالفت میں کچھ کمی کی جا رہی ہے؟ اور کیا مخالفت کی اس کُہنہ رَوِش میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے! یعنی یہ کہ کسی کے کان میں قرآن کی آواز پڑنے نہ دو۔ جب کوئی قرآن کی طرف دعوت دے تو خوب شور مچاؤ۔ چاروں طرف سے غل مچا دو کہ کافر، بے دین، گمراہ، مُلحد، خدا و رسولؐ کا دشمن، اسلاف کی عزّت پر حملہ کرنے والا، کسی "نئے دین" کا مدعی۔ غل مچاؤ اور ایسے زور سے مچاؤ کہ اس کی آواز کسی کے کان تک نہ پہنچنے پائے، کہ اگر قرآن کی آواز کسی کے کان تک پہنچ گئی تو ہماری سیادت ختم ہو جائے گی۔ برہمنیت کی گدیاں چھن جائیں گی۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے جب فرقہ "اہلِ قرآن" کی اس طرح مخالفت ہوتی ہے تو ہم نے سمجھا تھا کہ مخالفت ان کی اس غلط رَوِش کی بنا پر ہی جو فی الواقعہ غلط تھی۔ وہ اپنے غلو و تشدد میں رسول اللہ صلعم کی صحیح حیثیت

Marfat.com

کو ہی بھلا بیٹھے اور انھوں نے حضورؐ کا منصب صرف اس قدر سمجھا کہ آپ نے (معاذاللہ) ایک چٹھی رساں کی طرح اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچا دیا، یا آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ ان کے نزدیک رسول کی حیثیت (معاذاللہ) ایک ریڈیو پوسٹ (آلۂ ابلاغ) کی سی ہو کہ محطۃ نشر الصوت میں جو کچھ نشر ہوا وہ آواز اس کے ذریعے سننے والوں تک آ پہنچی۔ یہ غلطی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔

ان کی غلطی ضرور تھی لیکن ہم نے اب محسوس کیا ہے کہ ہماری برہمنیت کی مسندوں کی طرف سے ان کی مخالفت ان کے اس غلط نہج سے کہیں زیادہ دعوت الی القرآن کی بناء پر تھی۔ یعنی وہ یہ غلطی نہ بھی کرتے تو بھی ان کی مخالفت ہوتی۔ یہ چیز ہم ذاتی تجربہ کی بناء پر لکھ رہے ہیں۔ قریب چار برس سے طلوع اسلام آپ کے سامنے ہے۔ اس کا مسلک، اس کی دعوت، اس کا نصب العین، اس کی روش سب کھلی کھلی اور واضح ہے۔ مسلمان کو پھر سے اس کے بھلاتے ہوئے سبق کی یاد دلانا اس کے پیشِ نظر ہے اور ظاہر ہے کہ وہ فراموش کردہ سبق سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مسلمان پھر سے قرآن کو اپنی زندگی کا نصاب بنالے۔ کہئے! اس میں کونسی بات خلافِ دین و آئین ہے۔ لیکن چونکہ دعوت قرآن کی طرف لوٹنے کی ہے۔ اس لئے اس ذہنیت کی طرف سے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اسکی مخالفت

Marfat.com

کیوں نہ ہوتی؟ مخالفت! اور پھر مخالفت کا انداز بھی وہی جس کا ذکر قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت میں کیا گیا ہے یعنی ایسا غل اور شور مچا دیا جائے کہ کسی کے کان تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ ذرا غور سے سنئے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک:-

ہماری دعوت

(۱) انسانوں کے لئے دین دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ دین کے اصول زمان و مکان کی حدود سے بلند ہوتے ہیں یعنی وہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے لئے ہیں اور قیامت تک کے لئے واجب العمل ہیں ان میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ کمی بیشی۔ دین کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے خود کر دی اور اسے محفوظ و مصئون شکل میں قرآن کریم میں منضبط کر دیا۔ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے سے دنیا و آخرت کی سرفرازیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اس ضابطۂ قوانینِ الٰہیہ کی اتباع کے بغیر نجات و سعادت کی کوئی شکل نہیں۔ یہ خدا کا آخری پیغام اور نبی اکرمؐ آخری رسول ہیں۔

(۲) رسول اللہ صلعم کے ذمے دین کا پہنچانا (رسالت) اور دین پر عمل کر کے دکھانا (امامت) تھا حضورؐ نے ان ہر دو فرائض کی تکمیل بوجہ احسن فرمائی۔ حضورؐ کی ذات گرامی علم انسانی کے افقِ اعلیٰ اور کمالاتِ بشری کے بلند ترین مقام پر جلوہ بار تھی۔

Marfat.com

(۳) حضورؐ نے دین پر عمل کر کے بتا دیا کہ اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام کس طرح ہوتا ہے۔ حکومتِ قرآنی کا قیام ہی دین کا منشاء ہے۔ جس میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے بجائے خدا کے قوانین جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) نافذ ہوں گے۔

(۴) قرآن کریم کے قانون اصولی شکل میں ہیں۔ انھیں نافذ کرنے کے لئے جزئی یا فرعی قوانین کی بھی ضرورت ہوگی۔

(۵) حضورؐ نے جب حکومتِ الٰہیہ کو قائم فرمایا تو اس میں جزئی یا فرعی قوانین بھی مرتب فرمائے۔ یہ قوانین اصولِ قرآن کی روشنی میں حضورؐ کے اجتہاد اور مجلسِ مشاورت کے تفقہ سے مدوّن ہوتے۔

(۶) جب حضورؐ نے قرآنی حکومت کو متشکل فرمایا تو حضورؐ کے سامنے عربوں کی ایک قوم تھی۔ اس قوم کے حالات اور اس زمانے کے اقتضاآت کو سامنے رکھتے ہوئے فرعی قوانین مرتب ہوتے۔ ان قوانین کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو وہ جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق تغیر و تبدل کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ دوسرے وہ جن میں ردّو بدل کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

(۷) جن جزئیات میں ردوبدل کی ضرورت محسوس نہ ہو وہ اسی شکل میں قائم رہیں گی۔

(۸) جو جزئی قوانین زمانہ کے اقتضاآت سے اثر پذیر ہونے والے ہوں گے

Marfat.com

ان ہیں قرآنی حکومت کے ارباب حل وعقد، اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے ماتحت تبدیلیاں کرتے رہیں گے۔ جیسا کہ جناب عبیداللہ صاحب سندھی نے تحریر فرمایا ہے کہ "اصل قانون اساسی متعیّن ہے۔ باتیں لازاُس وقت (یعنی حضورؐ کے عہد اور خلافتِ راشدہ ہیں) اور تھے اس وقت اور ہوں گے جن ہیں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اسی کا نام فقہ ہے۔"

(۹) عہدِ رسالتمآب اور خلافتِ راشدہ ہیں حکومتِ الٰہیہ کا قیام کِس طرح ہوا اس کا علم اس عہدسعادت مہد کی تاریخ سے ہوگا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کتب روایات دین کی تاریخ ہیں تو اس سے یہی مطلب ہوتا ہے۔

(۱۰) ظاہر ہے کہ اس تاریخ دین (کتب روایات) ہیں مختلف قسم کی چیزیں ہوں گی۔ مثلاً

(۱) قرآنی اصولوں کی جزئیات جو حضورؐ نے بہ حیثیت امام حکومتِ قرآنی متعین فرمائیں۔

(۲) وہ باتیں جو حضورؐ نے اپنی ذاتی حیثیت سے فرمائیں یا اپنے زمانے کی عام معاشرت کے لحاظ سے کیں۔

(۳) ایسی باتیں جو لوگوں نے وضع کر کے حضورؐ کی طرف منسوب کر دیں۔

Marfat.com

شق ۱ کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ شق ۲ ایک واضح حقیقت ہے۔ حضورؐ عرب میں پیدا ہوئے۔ اُس زمانے اور اُس ملک کی عام معاشرتی زندگی میں سے جن چیزوں کی ممانعت اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی۔ حضورؐ نے لامحالہ وہی معاشرت اختیار فرمائی۔ رہنے سہنے، خورونوش، سواری، لباس، مکان وغیرہ عام معاشرت کی چیزیں ہیں۔ کتب روایات میں بہت سی چیزیں اس نہج کی ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت جابر ابنِ عبداللہؓ سے روایت ہے کہ وہ حضورؐ کے ساتھ پیلو کے درخت کے پھل چُن رہے تھے اور حضورؐ فرماتے جاتے تھے کہ سیاہ پھل تلاش کرو کیونکہ وہ اچھا ہوتا ہے۔ (بخاری شریف کتاب الانبیاء)

شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور کھجوروں میں گابھا لگانے کا واقعہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جو حضورؐ سے علیٰ سبیل عادت یا بحسب اتفاق عمل میں آتے یا مصلحت وقت کے اعتبار سے سرزد ہوتے۔ (حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ص ۱۰۲) اس باب میں سب سے بڑی مثال حضرت زیدؓ کا واقعہ ہے جو خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔ حضورؐ نے حضرت زیدؓ سے واضح الفاظ میں فرمایا کہ امسك عليك زوجك ۳۳/۳۷ یعنی اپنی بیوی کو طلاق نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد اپنی ذاتی حیثیت سے تھا۔ ورنہ اگر یہ دین کا حکم ہوتا تو حضرت زیدؓ کب جرأت فرما سکتے

Marfat.com

تھے کہ اس سے سرتابی کرتے ! اور اگر (خدا نکردہ) سرتابی کرتے تو یہ معصیتِ رسول تھی جس کی سزا سب کو معلوم ہے۔ سو اس قسم کے امور حضورؐ کی ذاتی حیثیت سے متعلق ہیں اور کتب روایات میں مذکور ہیں۔

احادیث کی حیثیت

شق ۳ کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ سوائے چند متشدّدین کے اور کسے انکار ہو سکتا ہے کہ ہماری کتب روایات میں صحیح اور ضعیف ہر قسم کی روایات موجود ہیں یہ کتابیں بہرحال انسانوں کی مرتب کردہ ہیں شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں ان کی صحیح پوزیشن یہ ہے کہ

صحیفۂ فردے از افراد بشر کہ بہ ارادۂ خود جمع علم پیغمبر کردہ است مانند صحیح بخاری و صحیح مسلم در ملّت ما" (الفرقان ص۲۶۵)

یعنی انسانوں میں سے ایک انسان کی کتاب جس نے علم پیغمبرؐ کو اپنے ارادے سے جمع کیا مثلاً بخاری اور مسلم کی صحیحین۔ یا جناب عبید اللہ صاحب سندھی کے الفاظ میں :-

"ہماری کتب احادیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں۔ نیز ان کتب احادیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے اور ہماری بہت سی کتب حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر اناجیلِ اربعہ کو ہماری صحاحِ اربعہ

Marfat.com

(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی) کے درجہ پر رکھ دیا جاتے تو ذرّہ برابر اختلاف نظر نہیں آتے گا۔" (ص۲۶۶)

یعنی ہماری کُتب احادیث تاریخ کی کتابیں ہیں اور بقول جناب سندھی "اس طرح انبیاء کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانے میں بھی رائج رہا ہے۔" (ص۲۶۵) جس طرح کتب اناجیل میں صحیح باتیں بھی ہیں اور موضوع بھی۔ اسی طرح ہماری کتب روایات کی حالت ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں۔" (ص۲۲۸) علامہ حمیدالدین فراہیؒ کا ارشاد ہے کہ:-

"یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے۔ .... حدیث، اجماع اور صحف اولیٰ یہ تینوں ظن وشبہ سے خالی نہیں .... میں نے بعض روایات دیکھی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اُکھاڑ دیتی ہیں ...... اکثر اہلِ حدیث کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا اس میں شک کی گنجائش نہیں بس ہم بعض قابلِ اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالےٰ نے علماء کو رب ٹھہرانے کی شناعت فرمائی ہے۔ پس ہم ان کے غیر معقول فکر و فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔" (نظام القرآن)

...ب روایات کے ...ں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ:-

Marfat.com

(۱) یہ علمِ پیغمبر کو جمع کرنے کی انفرادی بشری کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

(شاہ ولی اللہ)

(۲) ان کی پوزیشن صحفِ اولیٰ یعنی کتب اناجیل کی سی ہے جن میں انبیاء کی سیرتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ (جناب عبید اللہ سندھی)

(۳) ان میں صحیح اور ضعیف ہر قسم کی روایات مخلوط ہیں۔

(جناب سندھی اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی)

(۴) ان کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے۔ بخاری اور مسلم بھی شک و شبہ سے بلند نہیں۔ (علامہ حمید الدین فراہی)

تفسیری روایات

عملی حیثیت کے بعد کتب روایات کی علمی حیثیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ روایات کے بغیر قرآن کریم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یعنی روایات، قرآن کریم کی تفسیر ہیں اور قرآن کریم کی جو تفسیر حضور نے فرمائی ہو اس سے بڑھ کر اور کونسی تفسیر ہو سکتی ہے۔ اس میں کیسے کلام ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی جو تفسیر حضور نے فرمائی ہو اس سے بڑھ کر کوئی اور تفسیر نہیں ہو سکتی لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ کتب روایات صحیح اور غیر صحیح روایات کا مخلوط مجموعہ ہیں اور ان میں علامہ فراہی کے الفاظ ہیں۔

Marfat.com

"بعض روایتیں ایسی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں
اور ان کے نظام کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔" (نظام القرآن)

اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ ملاحم (پیشین گوئیاں) مغازی (لڑائیاں) اور تفسیر (تذکرۃ الموضوعات صـ۸۲) معارفِ قرآنیہ کی تفسیر کے متعلق ایک چیز اصولاً سامنے رکھنی چاہیے قرآن کریم انسانوں کے لئے قیامت تک کے لئے بطور نصاب مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے وہ قیامت تک انسانی علم و عقل کا ساتھ دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کی جو آیت آج پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے، آنے والے زمانے کی علمی سطح بلند ہو جانے سے اس کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ قرآن کریم میں تیرہ سو سال سے لکھا ہوا چلا آرہا تھا کہ اللہ تعالٰے نے فرعونِ موسٰی کی لاش کو پانی سے بچا لیا تاکہ وہ آنے والوں کے لئے قدرتِ حق کی نشانی ہو (سورۃ یونس) اس کی تفسیر میں مفسرین حضرات کو طرح طرح کی قیاس آرائیوں سے کام لینا پڑا اور مشکلات پیش آئیں ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں جب علمائے اثریات نے مصر کے تہ خانوں سے فراعنۂ مصر کی ممی شدہ لاشوں کو دریافت کر کے انھیں دنیا کے سامنے رکھ دیا تو قرآن کریم کی اس آیت مقدسہ کی صحیح تفسیر سامنے آگئی۔ مفسرین کے متعلق تو بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات ان کے بس میں نہ تھی کہ قرآن کریم کی اس بیان کردہ حقیقت کو

Marfat.com

بے نقاب دیکھ لیتے لیکن نبی اکرمؐ علمِ انسانی کے معراجِ کمال پر تھے، اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر تمام حقائق کو بے نقاب کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ حضورؐ ایک آیت کی تفسیر بیان فرمائیں اور وہ (معاذ اللہ) حقیقت کے خلاف ثابت ہو۔ اس لئے اگر کتب روایات میں اس قسم کی تفسیری روایتیں ملیں جو علم اور عقل کے خلاف ہوں تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ حضورؐ کی تفسیر نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی روایت کی صحت پر اصرار کرے گا تو زیادہ سے زیادہ (بصد تامل) اتنا کہا جا سکے گا کہ شاید حضورؐ نے اُس زمانے کی عام علمی سطح کے پیشِ نظر، عوام کو سمجھانے کے لئے ایسا فرما دیا ہو۔ لیکن پھر بھی ہم پہلی صورت کو ترجیح دیں گے۔ یعنی یہ کہ روایت غیر صحیح ہے مثلاً:-

(۱) فلکیات کے متعلق سترہویں صدی عیسوی سے پیشتر دنیا میں عام طور پر بطلیموس کا نظام صحیح مانا جاتا تھا۔ یعنی زمین کو ساکن تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ بھی عام عقیدہ تھا کہ "آسمان" شیشے کی بہت بڑی دَلدار چھت سی ہے جس کی موٹائی کا اندازہ یہ ہے کہ وہ پانچ سو برس کا راستہ ہے اور یہ کہ ستارے اس شیشے کے اندر ٹکے ہوئے ہیرے اور جواہرات ہیں جو رات کو چمکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بعد کی علمی تحقیقات نے علیٰ وجہ البصیرت ثابت کر دیا کہ بطلیموسی نظام غلط اور عوام کے عقائد توہمات ہیں۔ یہ مختلف کُرّے فضا میں تیرتے پھرتے ہیں اور اپنے محدود پر نیز ایک دوسرے کے گرد

Marfat.com

چکّر لگا رہے ہیں، اور سورج معہ اپنے نظام کے ایک متعینہ منزل کی طرف جارہا ہے۔ تو اس وقت ہماری سمجھ میں آگیا کہ قرآن کریم کی ان آیات کا کیا مطلب ہے کہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (تمام کرّے اپنے اپنے فلک پر تیرتے پھرتے ہیں) والقمر قدرنٰہُ منازل (ہم نے چاند کی منزلیں مقرّر کر رکھی ہیں) والشمس تجری لمستقرٍ لّھا۔ (الشمس اپنے مستقر کی طرف جارہا ہے) وغیرذالک لیکن بخاری شریف میں آیت والشمس تجری لمستقرٍ لّھا کی تفسیر میں حسب ذیل روایت آتی ہے:۔

"حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ایک روز غروب آفتاب کے وقت میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا:۔ ابوذر تم جانتے ہو کہ سورج کہاں ڈوبتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول ہی خوب واقف ہیں۔ فرمایا کہ یہ جاکر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔ یہی مطلب ہے خدا کے اس قول کا وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا ......" (بخاری کتاب التفسیر)

فلکیات سے متعلق ایک دوسری روایت یں ہے۔

"حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس نے ایک بار ارشاد فرمایا:۔

کہ دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی اور عرض کیا کہ الٰہی میرا بعض حصہ بعض کو کھائے جاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو دو سانس لینے کا حکم دیا۔ ایک سانس موسم سرما میں اور ایک سانس موسم گرما

Marfat.com

ہیں۔ چنانچہ بہت سخت گرمی اسی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بہت سخت سردی بھی اس کی وجہ سے۔" (بخاری شریف۔ جلد دوم)

ہم اس چیز کو حیطۂ تصور میں بھی لانے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ (معاذ اللہ) حضورؐ کو اس بات کا علم نہ تھا کہ غروب آفتاب زمین کی محوری حرکت کی وجہ سے ہے اور موسموں کا تغیر و تبدل اس کی دوری حرکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم ان روایات کو حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضورؐ نے مخاطب کی علمی سطح کی بناء پر ایسا سمجھا دیا تھا تو بھی آنے والوں کے لئے، جب ان کے زمانے کے علمی انکشاف حقیقت کو بے نقاب کر دیں اور وہ قرآن کے ان معارف کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں، اس تشریح کی پابندی نہیں رہتی جو حضورؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

یا مثلاً قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ ذکر کیا ہے کہ جس خدا میں یہ قدرت ہے کہ وہ خاک کے ذرّوں کو انسان بنا سکتا ہے اس کیلئے یہ کیا مشکل ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد پھر زندگی عطا فرما دے! یعنی قرآن کریم مبداء سے معاد پر دلیل لاتا ہے اور یہ دلیل بڑی حکیمانہ ہے کَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ وَعْدًا عَلَیْنَا اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ (جس طرح ہم نے پہلی بار پیدا کر دیا تھا ویسے ہی دوبارہ پیدا کر دیں گے)۔ لیکن اس آیت کی تفسیر

Marfat.com

یں ہمیں یہ روایت ملتی ہے۔

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں حضورؐ اقدس نے ارشاد فرمایا تم حشر کے دن ننگے پاؤں ننگے سر بغیر ختنہ کئے اٹھاتے جاؤ گے۔ اس کے ثبوت میں حضورؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کما بدأنا ...... فاعلین۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا سب سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا۔ اس روز میرے بعض صحابیوں کو بائیں جانب والی قطار کی طرف کھینچا جائے گا (یعنی دوزخیوں کی قطار میں) میں کہونگا یہ تو میرے صحابی ہیں۔ کھینچنے والا کہے گا کہ آپ کے جدا ہو جانے کے بعد یہ لوگ ایڑیوں کے بل (اسلام سے) لوٹ گئے تھے۔ میں اس وقت وہی کہوں گا جو اس نیک بندے (عیسٰی) نے کہا تھا وکنت علیہم شہیدا (یعنی جب تک میں ان میں رہا ان کا نگراں رہا بعد کا میں ذمہ دار نہیں)" (بخاری شریف جلد دوم)

اس تفسیر کو حضورؐ کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟ اور پھر روایت کا آخری حصہ تو صاف بتا رہا ہے کہ حضورؐ کے صحابہؓ کے دشمنوں کی طرف سے اس روایت کو وضع کیا گیا ہے۔

یا مثلاً قرآن کریم میں ہے:-

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی

Marfat.com

فَبَرَّأَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا ۝ (۳۳/۶۹)

(اے ایمان والو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے موسیٰ کو ایذا دی سو اللہ تعالیٰ نے ان باتوں سے جو وہ لوگ کہتے تھے۔ اسے بری کر دیا اور وہ اللہ کے ہاں آبرومند تھا۔

قرآن کریم میں قصۂ بنی اسرائیل میں متعدد مقامات پر اس امر کا ذکر موجود ہے کہ وہ لوگ حضرت موسیٰ کو کس طرح قدم قدم پر دق کرتے تھے اور ان کے عظیم الشان مقصد کے راستے میں روڑے اٹکاتے تھے حتیٰ کہ ان کا انداز تخاطب گستاخانہ اور روش شرارت آمیز اور فتنہ انگیز ہوتی تھی لیکن بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سرفرازی اور آبرومندی عطا فرمائی۔ اس آیت کی تفسیر میں ہمیں حسب ذیل روایت ملتی ہے۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں حضور والا نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰ نہایت باحیا اور ستر کو چھپانے والے تھے۔ چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لئے کوئی ان کے حصۂ بدن کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن بعض موذی بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی اور کہنے لگے کہ یہ اس قدر پردہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے برص ہے یا بادخایہ ہے یا کوئی اور مرض اس لئے خدائے تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ موسیٰ کو بنی اسرائیل کی افترا بندی سے بری کر دے چنانچہ ایک روز حضرت موسیٰ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوتے کپڑے اتار کر

Marfat.com

پتھر پر رکھے اور خود غسل کرنے کے لگے۔ غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے لینے کے لئے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا۔ موسیٰ لاٹھی لے کر پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوتے چلے۔ او پتھر میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے پاس تک پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا کہ بہت عمدہ ساخت کے آدمی ہیں۔ خدائے تعالٰی نے (اس طرح) بنی اسرائیل کی افترا بندی سے ان کو بری کر دیا۔ بالآخر پتھر رک گیا۔ موسیٰ نے اپنے کپڑے لے لئے اور پھر لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے .... حضور نے فرمایا اللہ تعالٰی کے مذکورۂ ذیل قول کا یہی مطلب ہے۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .....

.... (بخاری شریف۔ جلد دوم)

ہم اس تفسیر کو کبھی حضورؐ کی ذات اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

یا مثلاً یہ کہ :-

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب خدائے تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ ہاتھ تھا ..... حضرت آدم کے بعد اب تک قد برابر چھوٹے ہوتے رہے۔"

(بخاری شریف۔ جلد دوم)

اسے بھی ہم حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے کہ یہ چیز علمی تحقیقات اور اثری انکشافات کے خلاف ہے یا مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین

Marfat.com

جھوٹ بولے تھے (بخاری شریف جلد سوم) اس روایت کو بھلا کس طرح حضورؐ کی طرف منسوب کرنے کی جرآت کی جا سکتی ہے۔ اس روایت کے تذکرہ کے بعد جناب ابوالکلام صاحب آزاد لکھتے ہیں کہ :-

"روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً راویوں سے غلطی ہوتی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔" (ترجمان القرآن۔ جلد دوم)

یا مثلاً یہ کہ :-

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم پر ایسا جادو کیا گیا تھا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔" (بخاری شریف۔ جلد دوم)

فرمائیے! کہ حضورؐ کے متعلق یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ آپؐ پر (معاذ اللہ) جادو کا اثر ہو گیا تھا کہ یہ بھی (مثلاً) یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے یا نہیں۔ حضورؐ اس قدر عظیم المرتبت اور جلیل القدر روحانی قوتوں کے پیکر مقدس تھے کہ کسی دوسرے کی قوتِ ارادی کا اثر حضورؐ پر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ حضرت

Marfat.com

موسیٰ کی خشک لاٹھی پر تو جادو کا اثر نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ تائید ایزدی شامل تھی اور نہ ہی حضرت موسیٰؑ پر ان ساحرین کا کوئی داؤں چل سکا لیکن اس ذاتِ اقدس و اعظم پر جس کی نظیر آسمان کی آنکھوں نے نہیں دیکھی (معاذاللہ) ایسا جادو چل گیا۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری روایات ہیں جنھیں ہم کسی طرح بھی حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ اسی قسم کی روایات کی بناء پر جناب عبیداللہ صاحب سندھی نے لکھا ہے کہ

"جس قدر میری توجہ قرآن کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا۔ اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا ...... بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نومسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔" (الفرقان ص۸۴-۲۸۵)

ہم نے خود ایسی روایات کو نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے جن پر مجالس عامہ میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ جب حالت یہ ہو تو ان چیزوں کو دین کیسے قرار دیا جا سکے۔

Marfat.com

پھر جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض چیزیں حضورؐ نے اپنے وقتی اور مقامی حالات کے ماتحت ارشاد فرمائی ہوں اور بعد میں آنے والوں پر بہ تغیرِ حالات، ان کی پابندی لازمی نہ ہو۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو امامہ باہلی نے کاشتکاری کا کوئی اوزار دیکھا تو فرمایا میں نے رسول اللہ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جس گھر میں یہ آلات آتے ہیں اس میں خدائے تعالیٰ ذلت داخل کرتا ہے"۔ (بخاری شریف باب الحرث) اگر کوئی شخص اس روایت کے صحیح ہونے پر اصرار کرے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکیں گے کہ قریش کی اُس زمانے کی عسکری زندگی اور اسکے مقتضیات کے پیشِ نظر حضورؐ نے شاید ان کے رجحان کو کھیتی باڑی کے کاموں سے ہٹانے کے لئے ایسا فرمایا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کاشتکار جو نوعِ انسانی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کا پیشہ ذلت کا نشان کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

یا مثلاً یہ روایت کہ الائمۃ من قریش۔ امام یعنی خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔ وقتی مصالح اور قریش کے اُس زمانے کے جوہرِ خصوصی کے اعتبار سے ہی ارشادِ نبوی صلعم قرار دیا جا سکتا ہے نہ کہ قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے لئے بہ حیثیتِ دین واجب العمل خلافت کی تخصیص اگر دوامی طور پر قریش کے ساتھ کر دی جائے تو اسلام کی روح جمہوریت اور عالمگیریت فنا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں خود ایک دوسری روایت موجود ہے کہ تمہارے اُوپر اگر کوئی

Marfat.com

ادنیٰ حبشی غلام بھی امیر مقرر کر دیا جائے تو تم اس کی فرمانبرداری کرو۔ اس دوسری روایت کو ہم اسناد پرکھے بغیر ہی صحیح تسلیم کریں گے اس لئے کہ یہ قرآنی تعلیم کی روح کے عین مطابق ہے۔

ہمارا مسلک یہ ہے وہ مسلک جس کی طرف ہم دعوت دیتے چلے آرہے ہیں یعنی جو قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح جو اس کے خلاف ہو وہ غلط۔ دین قرآن کریم کے اندر مکمل ہے اور وہی غلط اور صحیح کے پرکھنے کا خدائی معیار ہے۔ کہا یہ جائیگا کہ اس طرح سے تو ہر شخص کو اجازت مل جائے گی کہ جس چیز کو اس کا جی چاہے صحیح تسلیم کرلے، جسے چاہے غلط قرار دیدے۔ اوّل تو یہ مفروضہ اس لئے غلط ہے کہ جب ہم نے قرآن کریم کو معیارِ حقیقی تسلیم کرلیا تو پھر کسی کے اختیار اور مرضی کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ دوسرے یہ کہ دین کی یہ انفرادی شکل جو آج ہم میں موجود ہے درحقیقت اسلامی شکل نہیں۔ اسلامی شکل میں ملت کا ایک مرکز ہوگا اور اس مرکز کا فیصلہ اختلافی امور میں قولِ ناطق ہوگا اور اس مرکز کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت ہوگی۔

جو کچھ گذشتہ سطور میں گذارش کیا گیا ہے۔ اس پر ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس میں کوئی بات ایسی بھی ہے جو دین کے خلاف ہو۔

Marfat.com

اگر آپ کے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات موجود ہو تو ہمیں مطلع کیجئے ہم اس پر پھر غور کرینگے بار بار غور کرینگے اور اگر آپ دیکھیں کہ اس میں کوئی چیز دین کے خلاف نہیں تو پھر اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ ان چیزوں کی مخالفت کیوں ہو رہی ہے کہ مخالفت کا اصلی راز ہم بتا چکے ہیں۔ مخالفت صرف اس لئے ہے کہ یہ دعوت قرآن کی طرف لوٹنے کی دعوت ہے اور اس کے لئے آڑ لے لی جاتی ہے حضورؐ کی عظمت کی۔ یعنی عوام کو بھڑکانے کے لئے یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ نبی اکرمؐ کی عظمت کے منکر ہیں۔ (معاذ اللہ، معاذ اللہ) ذرا غور کیجئے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ حضورؐ پر ایک کافر نے ایسا جادو کیا تھا کہ حضورؐ کو (نعوذ باللہ) یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ میں فلاں کام کر چکا ہوں یا نہیں۔ وہ تو حضورؐ کی عظمت کا ماننے والا سمجھا جائے اور جو یہ عقیدہ رکھے کہ حضورؐ کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ آپ پر کسی کے جادو کا اثر ہو سکے، اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ حضورؐ کی عظمت کا قائل نہیں، آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ انمیں سے کون حضورؐ کی عظمت کا قائل نہیں ہے۔ یاد رکھئے ہم جن چیزوں سے انکار کرتے ہیں تو اسلئے انکار کرتے ہیں کہ انکے صحیح تسلیم کر لینے سے حضورؐ کی عظمت و رفعت پر (معاذ اللہ) حرف آتا ہے اور اسے ہم کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کا عقیدہ ان چیزوں کو برداشت کر سکتا ہے تو اسے یہ عقیدہ مبارک! لیکن ہمیں کیوں مجبور کیا جائے کہ ہم اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق اس قسم کا عقیدہ رکھیں۔

Marfat.com

ایک خط

(نوشتہ جون ۱۹۴۲ء)

...... انہی دنوں مجھے رسالہ البرہان کے مدیر جناب سعید احمد صاحب فاضل دیوبند کی کتاب "فہم قرآن" کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتاب (بزعمِ خویش) "منکرینِ حدیث" کی مخالفت میں لکھی گئی ہے۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جناب سعید احمد صاحب روایات کے بارے میں بعینہٖ وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو طلوعِ اسلام میں پیش کیا گیا ہے لیکن بایں ہمہ یہ حضرات روایات کے سب سے بڑے حامی اور طلوعِ اسلام گردن زدنی۔

جناب سعید احمد صاحب شروع میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں اب ایسے حضرات کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو مطالبِ قرآنی کے صحیح فہم کے لئے احادیث کے علم کو شرط قرار نہیں دیتے۔ اُن کی رائے میں احادیث ناقابلِ اعتبار واستناد ہیں اور اس بنا پر اُن میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ تشریحِ احکام یا تفسیرِ قرآن میں ان سے مدد لی جائے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے۔

سنّت سے احتجاج کا انکار ہمارے دورِ ناسعود کی ہی خصوصیت نہیں
بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سنّت کو قابلِ احتجاج تسلیم نہیں
کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے نویں صدی ہجری
کے آخر میں مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسّنّۃ نامی کتاب اسی طرح
کے ایک منکرِ حدیث کے رد میں تصنیف فرمائی تھی جو مصر سے شائع
ہو چکی ہے۔ (فہم قرآن ص۵۹)"

اس کے بعد ارشاد ہے :۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہمارے لئے قابلِ احتجاج دو
چیزیں ہیں ایک اللہ کا فرمان اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا ارشاد۔ اگر صرف اللہ کا فرمان یعنی وحیِ متلو ہی لائقِ استناد
ہوتا تو "الرسول" فرمانے کی کیا وجہ ہے؟ (ص۶۳)"

اور ملاحظہ فرمایئے :۔

"پس جو سنّت قرآن پر کسی طرح بھی زائد ہوگی وہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک مستقل تشریح ہے اور اس کی
اطاعت واجب اور معصیت حرام ہے" (ص۶۶)

اس آخری اقتباس کو اچھی طرح نگاہ میں رکھئے۔ کیونکہ ذرا آگے چل کر اس دعوے کے متعلق بڑے دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوگا۔ اس حماینت کے بعد اب یہ دیکھئے کہ تدوینِ حدیث کے متعلق آپ کے کیا ارشادات ہیں :۔

تدوینِ حدیث عہدِ نبوت میں نہیں ہوئی | یہ ایک ناقابلِ انکار

Marfat.com

حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حدیث لکھنے
کا اہتمام نہیں کیا گیا جتنا کہ قرآن مجید کے لکھنے کا کیا گیا۔ بلکہ
بعض احادیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتابتِ
حدیث کی ممانعت کر رکھی تھی۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا:۔

لا تکتبوا عنّی ومن کتب عنّی غیر القرآن فلیمحہ
وحدّثوا عنی فلا حرج ومن کذب علیّ متعمدًا فلیتبوّأ
مقعدہ من النار۔ صحیح مسلم

(تم میری حدیث نہ لکھو اور جو شخص قرآن کے علاوہ میری حدیثیں
لکھتا ہو اس کو چاہئے کہ انھیں مٹا دے۔ ہاں میری حدیث بیان
کیا کرو تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور جو شخص قصدًا مجھ پر جھوٹ
باندھے اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہئے) (فہم قرآن ۵۶)

بہر حال یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ کے
اقوال و افعال کو قلمبند کرنے کا اہتمام نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی
وفات کے بعد صحابہ کرام کے پاس بجز قرآن کے کوئی دوسرا صحیفہ نہیں تھا
کسی ضرورت کے وقت اگر وہ کوئی حدیث بیان بھی کرتے تھے تو اپنے حافظہ
سے بیان کرتے تھے۔

بعض خاص صحیفے بخاری کی ایک روایت سے صرف حضرت عبدا

بن عمرؓو کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث کی کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جو کثرتِ روایت میں مشہور تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بجز عبداللہ بن عمرؓو کے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ احادیث قلمبند کرتے تھے اور میں زبانی یاد رکھتا تھا۔ بعض حفّاظ نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابت نے علم الفرائض میں کوئی کتاب لکھی تھی لیکن اصل یہ ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں جن صحیفوں کا ذکر ملتا ہے وہ زیادہ تر زکوٰۃ وغیرہ کے خاص احکام سے متعلق تھے ورنہ پہلی صدی ہجری کے ختم تک نہ باقاعدہ تدوینِ حدیث کی طرف توجّہ کی گئی اور نہ کہیں اس کا اہتمام کیا گیا۔

ابوجحیفہ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضرت علی سے دریافت کیا:۔

هل عندکم کتابٌ (کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے؟)

فرمایا:۔ لا الّا کتاب الله او فهم اعطیه رجل مسلم او ما فی هٰذه الصحیفة

(فرمایا۔ نہیں۔ صرف کتاب اللہ ہے یا وہ سمجھ جو کسی مسلمان کو عطا کی گئی ہو۔ یا وہ جو اس صحیفہ میں ہے۔

ابوجحیفہ نے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولے العقل وفکاك الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر (یعنی دیت کے اور قیدی کو رہا کرانے کے احکام اور ایک یہ حکم کہ کوئی مسلمان کسی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔ غرضکہ پہلی صدی ہجری تک یہی حال رہا۔

Marfat.com

ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دوسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں ڈاکٹر زبیر صدیقی کلکتہ یونیورسٹی نے "تدوینِ حدیث عہد نبوت میں" کے عنوان سے انگریزی زبان میں ایک نہایت محققانہ اور قابلِ قدر مضمون پڑھا تھا جو ادارہ کی رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت تدوینِ احادیث کا کام سرکار رسالت مآب کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم پورے مضمون کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے۔ موصوف جن کو مجموعہ ہائے احادیث کہتے ہیں وہ دراصل صحف تھے جن میں بعض خاص خاص احکام درج تھے۔ (حاشیہ فہم قرآن صفحہ ۹۱-۹۲)

دوسری صدی ہجری یعنی عہد تابعین میں بھی نہیں ہوئی

جب عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے اور آپ نے دیکھا کہ جن بزرگوں کے سینوں میں اقوال و افعال نبوی کا ذخیرہ موجود ہے یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں ان سرچشمہ ہائے سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں تو آپ نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث اور سنت آپ کو ملے اس کو لکھ لیجئے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم نہ مٹ جائے اور علماء فنا نہ ہو جائیں اور تم صرف وہی کہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اور علم کو پھیلنا چاہیئے اور آپس میں مجالست کرو تاکہ جو شخص نہیں

Marfat.com

جانتا وہ بھی جان جاتے۔

ابوبکر بن محمد انصار مدینہ میں سے تھے سلیمان بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ سنہ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سنہ ۹۹ھ سے رجب سنہ ۱۰۱ھ تک خلیفہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کی تحریک سنہ ۱۰۰ھ سے لگ بھگ شروع ہو گئی تھی لیکن افسوس ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے باعث اس وقت بھی تدون کا کام انجام نہیں پا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوبکر بن محمد کے مجموعۂ احادیث کے وجود کا پتہ اب تک کہیں نہیں مل سکا ہے اور نہ جامعینِ حدیث میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

اس بنا پر بعض مستشرقین نے اس روایت کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار ہی کر دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ روایت سے صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کا جمعِ احادیث کی طرف متوجہ ہونا اور ابوبکر بن محمد کو اس کے لئے حکم کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس حکم کی تعمیل میں احادیث جمع بھی کر دی گئی تھیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر مسموم ہونے کے باعث حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اچانک موت نہ ہو جاتی تو آج ہمارے پاس سب سے قدیم مجموعۂ احادیث موجود ہوتا۔ (فہم قرآن ص ۹۱-۹۲)

عہدِ بنی عباس میں تدوینِ حدیث کا آغاز

بنو عباس کے عہدِ حکومت

Marfat.com

میں جب علم وفن کا چرچہ عام ہوا اور علوم وفنون کی تدوین شروع ہوئی تو علمائے اسلام نے سب سے پہلے مختلف شہروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور آپ کی سیرت مقدسہ مدوّن کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ (فہم قرآن ص۹۳)

دوسری وجہ یہ ہے کہ اجلّہ صحابہ چاہتے تھے کہ قرآن وحدیث میں مرتبہ کے اعتبار سے فرق باقی رہے۔ کتب میں مدوّن ہوجانے کے باعث ایسا نہ ہو (جیسا کہ ہوا ۱۲) کہ لوگ قرآن کو بھول جائیں اور اپنی تمام توجہ حدیث پر مبذول کردیں۔ روایات وآثار سے ان دونوں باتوں کی تاکید ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ خطبہ میں ارشاد فرمایا ہر وہ شخص جس نے کچھ احادیث لکھ رکھی ہوں میں اس کو قسم دیتا ہوں کہ ان سے رجوع کرلے اور انھیں مٹا دے۔ پھر فرمایا:-

فانما هلك الناس حيث اتبعوا احاديث علمائهم
وتركوا كتاب ربهم۔

(لوگوں نے جب کبھی اپنے علماء کی باتوں کا اتباع کیا اور اپنے
رب کی کتاب چھوڑ دی ہلاک ہوگئے")

(اس روایت میں "احادیث علمائہم" کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں)
(فہم قرآن ص۹۹-۱۰۰)

اس مقام پر ایک اور روایت کا نقل کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے

Marfat.com

جن سے عدمِ کتابتِ حدیث کے وجوہ و اسباب پر کامل روشنی پڑتی ہے۔
عبدالرحمٰن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھے اور حضرت علقمہ کو کہیں سے ایک صحیفہ مل گیا۔ ہم دونوں اُسے لیکر غروب آفتاب کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس گئے اور دروازے پر بیٹھ گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جاریہ سے فرمایا دیکھنا دروازے پر کون ہے؟ جاریہ بولی علقمہ اور اسود۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ہم کو اجازت دیدی۔ گھر میں داخل ہو کر ہم نے وہ صحیفہ دکھایا اور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے حضرت عبداللہ نے جاریہ کو طشت میں پانی بھر کر لانے کا حکم دیا۔ جاریہ نے حکم کی تعمیل کی آپ نے فوراً پانی سے بدستِ خود اس صحیفہ کو مٹانا شروع کر دیا۔ اور نحن نقص علیک احسن القصص پڑھنے لگے۔ ہم نے کہا ذرا اس کو دیکھ لیجئے۔ اس میں ایک عجیب حدیث ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پھر بھی نہ مانے اور اس صحیفے کو مٹاتے ہی رہے اور فرمایا:۔

ان ھٰذہ قلوب اوعیۃ فاشغلوھا بالقراٰن ولا تشغلوھا بغیرہ۔

(یہ دل برتن ہیں۔ ان کو تم قرآن مجید سے پُر کرو۔ اور اس کو دوسری چیز سے مت بھرو)

ابو عبید[1] جو اس قصہ کے راوی ہیں اور سند میں مذکور بھی ہیں کہتے ہیں معلوم

---

[1] ابو عبید نیچے کے راوی ہیں اور بغیر کسی ثبوت کے صرف اپنا ایک خیال ظاہر کرتے ہیں، اس لئے یہ اعتذار کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ ۱۲ ادارہ

Marfat.com

ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہل کتاب سے لیا گیا تھا۔ اس لئے حضرت ابن مسعودؓ نے اس کو دیکھنا بھی مکروہ سمجھا۔ (فہم قرآن صفحہ ۱۰۱)

حضرت عمرؓ خود بھی روایت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی قلتِ روایت کی تاکید کرتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک لشکر عراق کی طرف روانہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے انھیں خطاب کر کے ارشاد فرمایا:۔

جوّدوا القرآن واقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔

(قرآن خوب اچھی طرح پڑھو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو)

بلکہ بعض اوقات تو غلط احادیث کی اشاعت کے خوف سے روایتِ حدیث کی ممانعت ہی کر دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کر کے فرمایا "تم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن میں تم خود مختلف ہوتے ہو۔ تمھارے بعد جو لوگ آئینگے وہ اس سے بھی زیادہ اختلاف کرینگے۔ پس رسول اللہ کی حدیث بیان مت کیا کرو۔ اور تم سے کوئی بات دریافت کی جاتے تو کہو ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کی کتاب ہی اس کے ہی حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ (فہم قرآن صفحہ ۱۰۵)

Marfat.com

وضع حدیث کی گرم بازاری

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے عہد میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی۔ جو کچھ حدیثیں تھیں زبانوں پر تھیں اور اسی طرح ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس تقریب سے منافقوں اور دشمنانِ اسلام کو احادیث وضع کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اختلاط و ارتباط پیدا کر کے احادیث موضوعہ کی نشر و اشاعت شروع کی اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ابن عدی کہتے ہیں عبد الکریم ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو اس نے کہا میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرمت و حلّت کے احکام ہیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔

وضاعین حدیث کے مختلف طبقے

علامہ سیوطی نے ابن جوزی سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی احادیث میں جھوٹ، وضع اور قلب پایا جاتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں۔ بعض وہ لوگ ہیں جن پر زہد غالب تھا۔ وہ احادیث کی حفاظت نہیں کر سکے یا ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ یحییٰ بن معین سے روایت ہے کہ میں نے جھوٹ اس جماعت سے زیادہ کسی میں نہیں پایا جو اپنے تئیں

Marfat.com

خیر اور زُہد کی طرف منسوب کرتی ہے۔ بعض وہ لوگ تھے جو اگرچہ ثقہ تھے لیکن ان کی عقلوں میں فتور آگیا تھا اور وہ پھر بھی روایتِ حدیث سے باز نہیں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھوں نے کوئی غلط روایت نقل کر دی، بعد میں انھیں اپنی غلطی کا علم بھی ہوگیا۔ لیکن ازراہِ سخن پروری انھوں نے رجوع نہیں کیا۔ ان مختلف لوگوں کے علاوہ ایک زندیقوں کا طبقہ تھا جو قصداً شریعت کو برباد کرنے اور اسلام میں فتنہ و شر کا دروازہ کھولنے کی غرض سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان زنادقہ میں کچھ لوگ ایسے جری بھی تھے جو موقع پاکر اپنے شیخ کی کتاب اُٹھا لیتے اور اس میں من گھڑت حدیثیں بھی شامل کر دیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو کسی خاص عقیدہ و خیال کے پابند تھے اور اس کو لوگوں میں مقبول بنانے کے لئے احادیث وضع کرتے تھے۔ ابن لہیعہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک خارجی العقیدہ شیخ نے کہا جس نے آخر میں توبہ کر لی تھی کہ ہم جب کسی امر کا ارادہ کرتے تھے تو فوراً اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔

حماد بن سلمہ فرماتے ہیں میں نے ایک رافضی سے سُنا وہ کہتا تھا کہ جب ہم کسی چیز کو اچھا سمجھتے تھے تو اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔ محمد بن القاسم الکاکانی فرقہ مرجیہ کا سردار تھا۔ اپنے عقیدہ کے مطابق کثرت سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان کے سوا کچھ وہ لوگ تھے جو ترغیب و

Marfat.com

ترہیب کے لئے وضع حدیث کو جائز سمجھتے تھے اور وہ ایسا کرتے بھی تھے۔

اسبابِ وضعِ حدیث

وضع حدیث کے اسباب مختلف تھے۔ اجمالاً انھیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) سیاسی جھگڑے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی وجہ سے خوارج اور شیعہ کے جو دو فرقے پیدا ہو گئے تھے ان کو اپنے اپنے عقیدہ میں اتنا غلو تھا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہؓ کی شان میں بے تکلف احادیث وضع کرنے اور من کذب علیّ متعمّداً فلیتبوّأ مقعدہ من النار کی وعید کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر بنو امیہ اور بنو عبّاس میں جو مستقل سیاسی رقابت قائم ہو گئی تھی اس نے اس چنگاری کو ہوا دے کر دہکتی ہوئی آگ بنا دیا۔ اسی قبیل میں وہ احادیث شامل ہیں جو عربی عصبیت اور عجمی خودداری کی کشمکش کے باعث اختراع کی گئیں۔

(۲) دوسری صدی کے وسط میں کلامی اور فقہی مسائل کا زور ہوا تو اپنی وجاہتِ علمی کو نمایاں کرنے کے لئے بعض لوگوں نے قصداً احادیث وضع کیں اور چونکہ مسلمان ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن وحدیث سے چاہتے تھے اس لئے بعض وضاعین نے اپنے نظریہ کی تائید کے لئے جان بوجھکر حدیثیں وضع کیں اور ان کا عام چرچہ کیا۔

(۳) شخصی حکومت کے استبداد کی وجہ سے بعض لوگ ایسی محکومانہ ذہنیت

Marfat.com

رکھتے تھے کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے سرکار دو عالم پر تہمت طرازی سے بھی باز نہیں آتے تھے؟" (فہم قرآن صلا ۹۶تا۹۸)

یہ تو ہوئی تدوینِ حدیث کی تاریخ۔ ان سے پوچھئے کہ جو کچھ طلوعِ اسلام میں شائع ہوا ہے اس میں اور ان کی اس تحقیق میں کیا فرق ہے۔ اس کے بعد آپ یہ فرماتے ہیں کہ احادیث پر کن اصول سے تنقید کی جاسکتی ہے۔ ارشاد ہے:

احادیث پر کن اصول سے تنقید کیجاسکتی ہے

مُلّا علی قاری نے موضوعات کے خاتمے پر حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں:۔

(۱) جس حدیث میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کے ستر زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔

(۳) جو حدیث صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

(۴) جو حدیث واقع کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہئے کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔

Marfat.com

(اگرچہ تجربہ کی رُو سے یہ مضمون درست ہے)

(۵) جو حدیث انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں۔ سبزہ زار، آب رواں اور خوبصورت چہرہ دیکھنا۔

(۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشگوئی بقید تاریخ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

(۷) وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے زیادہ مشابہ ہوں مثلاً یہ کہ ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے۔ یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

(۸) وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہوگی۔ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کب آئے گی۔ حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔

(۱۰) بعض وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

(۱۲) بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں"۔

یہ تھے اصول۔ اب اس کے بعد یہ دیکھئے کہ روایات کے موجودہ مجموعے مثلاً

Marfat.com

صحیحین بالخصوص صحیح بخاری پر بھی تنقید جائز ہے یا نہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

ہمارے مجموعہ ہائے حدیث حتیٰ کہ صحیح بخاری میں کیا ایسی روایتیں موجود ہیں جو درایۃً صحیح نہ ہوں؟

اِن اصول کی بنا پر ہر زمانے میں روایات پر تنقید کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر روایتِ معراج کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثابت کی روایت میں جو "فربطتہ بالحلقۃ" کہ میں نے براق کو حلقہ سے باندھ دیا آیا ہے تو حضرت حذیفہ اس کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو اس لئے باندھ دیا تھا کہ اُس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا؟ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اُس وقت آپ کے لئے عالمِ غیب وشہادت کو مسخر کر دیا تھا۔

اسماعیلی — بخاری کی روایت جس کا مضمون یہ ہے کہ "حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آزر سے قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ آزر کے چہرے پر تارکول مَلا ہوا ہوگا" نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس خبر کی صحت میں نظر ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ اُن سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قیامت کے دن اُن کے باپ آزر کو رسوا نہیں کرے گا تو پھر اس کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے"

Marfat.com

حافظ ابن حجر حدیث ابی ہریرہؓ :-

خلق اللہ آدم وطولہٗ ستون ذراعاً۔

(اللہ نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور ان کا طول ساٹھ گز کا تھا)

کے متعلق کلام کرتے ہوتے لکھتے ہیں کہ امم گذشتہ کے جو آثار ثمود کے دیار کی طرح مٹے ہوتے پائے جاتے ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد وقامت ترتیبِ سابق کے اقتضاء کے مطابق بہت زیادہ طویل نہیں تھے۔ حالانکہ اُن کا زمانہ بھی بہت قدیم ہو اور جو زمانہ قوم ثمود اور حضرت آدم کے درمیان ہے وہ اس زمانہ سے کم ہے جو قومِ ثمود اور اُمتِ مسلمہ کے شروع زمانہ کے درمیان ہو۔ اب تک مجھ کو اس اشکال کا حل معلوم نہیں ہوا۔ (فہم قرآن صفحہ ۱۷۲-۱۷۳)

یہاں تک تو تدوینِ حدیث کی تاریخ اور روایات کے موجودہ مجموعوں کی تنقید سے بالاتر نہ ہونے کے متعلق ذکر تھا۔ اس سے آگے بڑھتے تو وہ دلچسپ ٹکڑا آپ کے سامنے آتے گا جس کے متعلق ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ جناب سعید احمد صاحب نے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے لئے قابلِ احتجاج دو چیزیں ہیں۔ ایک اللہ کا فرمان اور دوسرا رسول اللہ کا ارشاد اور یہ کہ جو سنّت کسی طرح بھی قرآن پر زائد ہوگی وہ آنحضرت کی طرف سے ایک مستقل تشریع ہے۔

اب دوسرا بیان ملاحظہ فرمائیے :-

حدیث مستقل تشریع نہیں بلکہ بیان و تفصیل وحی الٰہی ہو | یہاں یہ واضح

Marfat.com

کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے حدیث کی تشریعی حیثیت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کو آیات بینات سے ثابت کر چکے ہیں لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ تشریع کے باب میں قرآن و حدیث دونوں ایک پلہ کے نہیں ہیں۔ قرآن قطعی الثبوت اور قطعی الدّلالۃ والحکم ہے اور حدیث ظنّی۔ پھر دونوں قوّت و حکم کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس بناء پر اگر کوئی حدیث قرآن مجید کے کسی قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ سند و الفاظ حدیث کے لحاظ سے اس میں متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرّسول اور ما اتاکم الرسول فخذوہ کو دیکھ کر یہ شبہ ہو گیا ہے کہ قرآن کی طرح سُنّت بھی تشریع میں مستقل حیثیت رکھتی ہے اور یہ خیال درست نہیں کیونکہ قرآن مجید نے ہی خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الّا وحیٌ یوحیٰ۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہ نازل شدہ وحی ہوتی ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل تو وحی (قرآن) ہے۔ اور نطق نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام اس سے نکلی ہوئی فرع۔ اس بناء پر لامحالہ نطقِ گرامی وحی متلو کے مطابق ہو گا۔ بالفرض اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نہ ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑے گا۔

Marfat.com

لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ قرآن کے ایک حکم ظاہر الدلالۃ سے متعارض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قول کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب ہی نادرست ہے۔

پس سنّت کی تشریع سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی طرح اس باب میں مستقل حیثیت رکھتی ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ سنت وحی الٰہی کے لئے بمنزلہ بیان اور تفصیل ہے۔

(فہم قرآن ص۹۴)

اس اقتباس سے حسب ذیل امور واضح ہیں:-

(۱) تشریع کے باب میں قرآن وحدیث دونوں ایک پلہ کے نہیں ہیں

(۲) قرآن قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ والحکم ہے اور حدیث ظنی۔

(۳) قرآن کی طرح سنّت، تشریع میں مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔

(۴) اگر قرآن وحدیث میں تعارض ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑیگا۔

(۵) سنت وحی الٰہی کے لئے بمنزلہ بیان اور تفصیل ہے مستقل تشریع نہیں۔

اِن اقتباسات کی روشنی میں میں ہر اس شخص سے جو علم اور دیانت رکھتا ہو پوچھتا ہوں کہ اگر حدیث کے متعلق اس عقیدہ کے بعد جو جناب سعید احمد صاحب نے بیان فرمایا ہے ایک شخص پکا حدیث کا ماننے والا کہلا سکتا ہے تو طلوعِ اسلام والوں نے کیا جرم کیا ہے جو ان کو اس طرح سے بدنام کرنے کی

Marfat.com

کوشش کی جا رہی ہے۔

طلوعِ اسلام میں منجملہ دیگر اُمور کے یہ لکھا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے فرعی احکام جو تغیراتِ زمانہ سے اثر پذیر ہو سکتے ہوں بعد کے خلفاء ان میں اپنے حالات کے مطابق تغیر و تبدل کر سکتے ہیں۔ اس کے متعلق سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ارشاد فرماتے ہیں:۔

فروعی قوانین کی تدوین

فروعی قوانین مدون کرنے کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مزاج شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تدبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہوگی وہ شریعت کا مزاج شناس ہو جائے گا اور ہر موقع پر اس کی بصیرت اس کو بتا دے گی کہ مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اس شریعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے گی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر و تبدل پیدا کیا جائے گا وہ نہ صرف مناسب اور معتدل ہوگا بلکہ اپنے محل خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ اتنا ہی بجا ہوگا جتنا خود شارع کا حکم ہوتا۔ اس کی مثال بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر نے یہ علم کہ

دورانِ جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے۔ اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا، اور حضرت عمر کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانے میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شرع کے صریح احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن جو شخص شریعت کا مزاج داں ہے وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکمِ عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصودِ شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے جو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا۔ قبیلہ مُزینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دے دیا پھر فوراً ہی آپ کو تنبّہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا اور ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھا لے تو اس کے لئے جائز ہو جائے۔ یہ کہکر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقاتِ ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے جو حکم صادر فرمایا وہ عہدِ رسالت کے عملدرآمد سے مختلف تھا، مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کئے گئے تھے اس لئے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ بخلاف اس کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاجِ شرع میں بے اعتدالی پیدا

Marfat.com

کرتا ہے۔ اور مُفضی الی الفساد ہو جاتا ہے"

سید صاحب اس عقیدے کے باوجود منکرِ حدیث نہیں ہیں۔

طلوعِ اسلام نے یہ بھی لکھا تھا کہ روایات دین کی تاریخ ہیں۔ جون، جولائی، اگست ۱۹۴۱ء کے ترجمان القرآن میں تدوینِ حدیث پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا تعارف جناب مودودی صاحب ان الفاظ میں کراتے ہیں :-

"حدیث کے متعلق ایک مدت سے ہندوستان میں غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں جن کی بناء چاہے نیک نیتی پر رہی ہو مگر بہر حال ناواقفیت پر تو ضرور قائم ہے اور اس سے فی الواقع دین کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے حال میں اس فتنہ میں پھر تازہ روح پھونکی گئی اور بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوتے۔ ترجمان القرآن میں اس سے پہلے حدیث کے متعلق متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں سے اکثر میری کتاب تفہیمات حصہ اول میں جمع کر دیئے گئے ہیں لیکن کوئی مبسوط بحث کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ الحمد للہ کہ اس کمی کو جناب مولانا مناظر احسن صاحب نے بطریقِ احسن پورا کر دیا ہے"

اس مضمون میں جناب گیلانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں :-

حدیث دراصل انسانیت کے ایک حیرتناک انقلاب کی تاریخ ہے ـــ اور بس	دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان حیرت انگیز

Marfat.com

انقلابی حصے کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات وحوادث سے گذر کر نسلِ انسانی موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ ان میں ایک ایسا واقعہ جس نے کسی خاص شعبۂ حیات ہی میں نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبوں میں انسانیت کا رُخ پلٹ دیا۔ جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں بلکہ بلا مبالغہ مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوتے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ماضی کے اسی دہشت، حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے۔

حدیث کو تاریخ کہنا نئی بات نہیں ہے

ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں۔ فنِ حدیث کے سب سے بڑے امام، امام الائمہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا نام جو رکھا ہے اگر اُسی پر غور کر لیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف بخاری شریف کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے بلکہ خود حضرت امامؒ نے اپنی کتاب کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم و ایامہ" رکھا ہے۔ اس میں امور اور ایام کے الفاظ قابل غور ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

Marfat.com

حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فنِ حدیث دراصل اُس عہد اور زمانہ کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوتی۔ بہرکیف اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہوکر پھل سے درخت کو پہچاننے کے اصول کو مدِ نظر رکھا جاتے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کرسکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہوسکتی ہے جس کی طرف امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام میں اشارہ فرمایا ہے اور میں نے جس کی تشریح کی ہے۔"

(تدوین حدیث ص ۳۸۳/۳۸۴)

اس میں وضاحت سے درج ہے کہ خود امام بخاریؒ، مولانا گیلانی اور مولانا مودودی صاحب کے نزدیک صحیح بخاری جیسی کتاب رسول اللہ ؐ کے عہد مبارک کی تاریخ ہی ہے۔

رسالہ معارف اور حدیث

اور سنئے۔ دار المصنفین کے سید سلیمان ندوی صاحب جس قدر حدیث کے مؤید ہیں وہ کوئی

Marfat.com

چھپی ہوئی حقیقت نہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب علامہ اسلم جیراجپوری نے روایات پر تنقید کے متعلق مضمون شائع کیا تھا تو معارف میں پے در پے ان کی مخالفت میں سینکڑوں صفحات شائع ہوتے تھے، لیکن اب ذرا آگے چلئے۔ فروری ۱۹۴۲ء کے معارف میں علامہ حمید الدین فراہی اور علم حدیث کے متعلق ان کے شاگرد مولوی امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس پر مدیر معارف سید سلیمان ندوی صاحب نے کوئی اختلافی نوٹ نہیں لکھا۔ غور فرمائیے کہ اس مضمون میں کیا کچھ لکھا گیا ہے۔

"دوسری بات یہ ہے کہ مولانا ان لوگوں کے خیال سے بھی اتفاق نہیں رکھتے جو بخاری و مسلم کی تمام مرویات کو ظن سے بالاتر سمجھتے ہیں اور یہ بات مولانا نے کوئی نئی اور عجیب نہیں لکھی ہے حافظ ابن حجر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی ان کتابوں کو ظن سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ ظن سے بالاتر تو سمایہ دنیا کے نیچے صرف ایک ہی کتاب ہے۔" (معارف صـ۹۴-۹۵)

اس کے بعد ارشاد ہے:۔

"پس ہم کو صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں ..... جب قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو تو اس وقت حکم قرآن ہوگا۔" (معارف صـ۹۲-۹۱)

صفحہ ۹۰ پر ارشاد ہے:۔

"یہاں مولانا نے بے شبہ یہ فرمایا ہے کہ احادیث میں ظن و شبہ

Marfat.com

کو دخل ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔"

لیجئے احادیث میں ظن و شبہ کے باب میں معاملہ علامہ فراہیؒ، مولوی امین احسن صاحب اور سید سلیمان ندوی تک ہی نہ رہا بلکہ ان حضرات کے قول کے مطابق یہ ایک ایسا مسلمہ ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو:

Marfat.com

مثلہ معہ

(قرآن کیساتھ قرآن جیسی کچھ اور چیز بھی)

دین کے بنیادی گوشے کے متعلق ایک اہم بحث

اکتوبر ۱۹۵۰ء کے طلوعِ اسلام میں حسبِ ذیل شذرہ قارئین کی نگاہ سے گذر چکا ہے:

"ترجمان القرآن بابت جولائی، اگست ستمبر ۱۹۵۰ء میں حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی کا ایک مضمون بعنوان "مزارعت پر تحقیقی نظر" شائع ہوا ہے جس کی تمہید میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اسلام میں احکام کا ماخذ صرف قرآن ہے۔ اس پر ترجمان القرآن (مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب) کی طرف سے حسبِ ذیل نوٹ شائع ہوا ہے:

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مُراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقع کے خلاف ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل دلائل و نظائر قابل غور ہیں۔

Marfat.com

(۱) مشہور حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، ان دونوں پر عمل کرتے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

(۲) مقدام بن معدی کرب سے سنن میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، لوگو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی کے مثل کچھ اور بھی۔ اسی "کچھ اور" کو حدیث، سنت اور وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان دونوں روایتوں کا اندازِ بیان بتلا رہا ہے کہ مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ سوال کہ احکام کا مستقل ماخذ کیا ہے بعد کی چیز ہے۔ ترجمان القرآن کے اس حاشیہ سے تو اس سے بھی کہیں اہم بات پیدا ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس چیز پر ایمان رکھے جو رسول اللہ صلعم کو خدا کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس وقت تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ اس سے مطلب قرآن ہے یعنی جو شخص قرآن پر ایمان لے آتے وہ اس چیز پر ایمان لے آتا تھا جو ما انزل الیک سے مفہوم تھا لیکن ترجمان القرآن کے اس حاشیہ سے یہ ظاہر ہے کہ ما انزل الیک صرف قرآن تک ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جو اس کے تحت میں آتا ہے۔ لہٰذا کسی شخص کے مسلمان ہونے

Marfat.com

کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ ما انزل الیک کے دوسرے حصّے پر بھی ایمان لاتے۔ کیونکہ وہ "اس کے ساتھ، اسی جیسا "منزل من اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کے ایسے معاملہ میں جس کا تعلق کفر اور ایمان سے ہے کوئی ابہام نہیں رہ جانا چاہیئے بلکہ جس طرح ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن اس کتاب کا نام ہے جو الحمد سے شروع ہو کر والنّاس تک ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح قرآن کے ساتھ قرآن جیسے دوسرے منزّل من اللہ حصّے کے متعلق بھی یہ قطعی طور پر متعیّن ہونا چاہیئے کہ وہ کیا ہے۔ مدیر ترجمان القرآن نے اس کے متعلق کہا ہے کہ اسے "حدیث، سنّت اور وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس سے یہ متعیّن نہیں ہوتا کہ قرآن کی طرح وہ کونسا صحیفہ ہے جو قرآن کی رو سے منزّل من اللہ ہے اور جسے منزّل من اللہ سمجھنا مسلمان ہونے کے لئے لازمی ہے۔

چونکہ اس سوال کا تعلق چالیس کروڑ مسلمانوں کے کفر اور ایمان سے ہے، اس لئے اس کا تعیّن نہایت ضروری ہے اور اس کی ذمّہ داری مدیر ترجمان القرآن کے سر ہے۔ کیا وہ براہ کرم مسلمانوں کو کافر ہونے سے بچانے کی خاطر اس کا قطعی تعیّن فرماویں گے؟ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خدا کی سند بھی ہونی ضروری ہے۔"

جب اس شذرہ کے جواب میں مدیر ترجمان القرآن کی طرف سے

Marfat.com

کوئی جواب موصول نہ ہوا اور نہ ہی ترجمان القرآن میں اس موضوع پر کچھ مزید شائع ہوا، تو ہم نے مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، انھیں ایک خط کے ذریعہ یاددہانی کرائی۔ اس خط کے جواب میں محترم مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اس طرح کے سوالات کی جواب دہی میں اپنا وقت صرف کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ اگر آپ ترجمان القرآن کا مطالعہ فرماتے رہے ہیں تو آپ کو میری رَوِش کا اندازہ خود ہی ہوچکا ہوگا۔"

چونکہ جیسا کہ طلوعِ اسلام کے مندرجہٴ بالا اقتباس سے ظاہر ہے، ہمارے نزدیک مسئلہ زیرِ نظر دینی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ مودودی صاحب کے محولہ صدر جواب کے بعد ہمارے لئے ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ ہم مسئلہ پیشِ نظر کے متعلق مودودی صاحب کی سابقہ تحریروں کی طرف رجوع کریں۔ ان کی سابقہ تحریروں میں سے اس وقت ہمارے سامنے "تفہیمات حصّہ اوّل" ہے جس میں انھوں نے حدیث کی دینی حیثیت کے متعلق مختلف مقامات پر شرح وبسط سے بحث فرمائی ہے۔ (تفہیمات دراصل ترجمان القرآن میں شائع شدہ مضامین ہی کا مجموعہ ہے) مسئلہ زیرِ نظر کو ہم انہی تحریروں کی روشنی میں جانچتے ہیں تاکہ حقیقت کھُل کر سامنے آجائے۔

Marfat.com

قرآن کریم میں ہے:

والذین آمنوا وعملوا الصالحات وآمنوا بما نزل علی محمد وھو الحق من ربھم کفر عنھم سیاٰتھم واصلح بالھم۔ (۴۷/۲)

اور جو لوگ ایمان لاتے اور انھوں نے اعمال صالح کئے اور وہ ایمان لاتے اس پر جو محمد پر نازل کیا گیا ہے۔ اور وہ ان کے رب کی طرف سے ایک حقیقت ہے۔ تو اللہ ان کی برائیاں ان سے دور کر دے گا اور ان کی حالت درست رکھے گا۔

قرآن پر ایمان

اس سے ظاہر ہے کہ "ما نزل علی محمد" (جو کچھ محمد پر نازل کیا گیا تھا) پر ایمان لانا شرطِ اسلام ہے اور وہ خدا کی طرف سے حق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ "ما نزل علی محمد" سے مراد کیا ہے؟ قرآن کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے۔

یٰس۔ والقراٰن الحکیم ..... تنزیل العزیز الرحیم (۳۶/۱-۵)

(یہ قرآن حکیم خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے)

رسول اللہ پر یہ قرآن خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوا۔

Marfat.com

قل اللہ شھید بینی و بینکم واوحی الی ھذا القراٰن لانذرکم بہ ومن بلغ ..... (۱۹/۶)

(ان سے کہو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن بذریعہ وحی اتارا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے (غیر فطری اعمال کے نتائج سے آگاہ کروں)

یعنی رسول اللہؐ پر قرآن بذریعہ وحی نازل ہوا اور قرآن ہی کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، انھیں بھی جو رسول اللہؐ کے مخاطب تھے اور اُن تمام انسانوں کو بھی جو حضورؐ کے بعد آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح طور پر فرما دیا کہ قرآن رسول اللہ کے اپنے خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا ہے۔

وما ینطق عن الھوٰی۔ ان ھو الا وحی یوحٰی (۳/۵۳)

(رسول اپنی خواہش نفس سے باتیں نہیں کرتا بلکہ یہ قرآن وہ وحی ہی جو اکی طرف بھیجی جاتی ہی رسول اللہؐ کو اسی قرآن کی اتباع کا حکم دیا گیا تھا۔ واتبع ما یوحی الیك من ربك (۲/۳۳) " جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے اس کی اتباع کرو"۔ خود رسول اللہ کی زبان مبارک سے یہ کہلوایا کہ " میں اس کے علاوہ جو مجھ پر وحی کیا گیا ہے اور کسی چیز کی اتباع نہیں کرتا"۔ (ان اتبع الا ما یوحی الی ۹/۴۶) اسی قرآن کی پیروی کا حکم تمام مسلمانوں کو دیا گیا اور خاص طور

Marfat.com

پھر کہہ دیا گیا کہ اس کے سوا اوروں کی پیروی مت کرو۔

اتباع صرف قرآن کی ہے

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (۷/۳)

(جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تم اسکی اتباع کرو اور اس کے علاوہ اور آقاؤں کی پیروی مت کرو)

اس قرآن کے متعلق فرمایا گیا کہ اس کی مثل کوئی ایک بات (حدیث) بھی نہیں لائی جا سکتی۔

فلیأتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین (۵۲/۳۴)

(اگر یہ لوگ سچے ہیں تو ان سے کہو کہ اس کی مثل کوئی ایک بات (حدیث) بھی لا کر بتائیں)

اور اسی قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون "ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"

مودودی صاحب کا ارشاد

یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ اس کے برعکس محترم مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں رسول اللہ کو قرآن کے علاوہ اور بھی بہت کچھ وحی کے ذریعے ملتا تھا جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کی مثل تھا اور اس کی اتباع بھی اسی طرح ضروری ہے

Marfat.com

جس طرح قرآن کی۔ اس دوسرے حصہ کا نام روایات ہے یعنی ان کے نزدیک وحیٔ خداوندی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ایک حصہ قرآن کریم میں درج کر دیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ روایات میں آجاتا تھا۔

آپ سارا قرآن چھان ماریئے، آپ کو کہیں یہ نہیں ملے گا کہ وحی کے دو حصے تھے، ایک قرآن اور ایک روایات۔ خود مودودی صاحب کی تحریروں میں بھی ہمیں ان کے اس عقیدہ کی تائید میں قرآن کی کوئی سند نہیں مل سکی۔ اس عقیدہ کا مدار ایک روایت پر ہے، جس میں لکھا ہے کہ حضورؐ کو قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل (مثلہ معہ) اور کچھ بھی بذریعہ وحی ملا اور وہ روایات ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ایک مختصر سی کتاب ہے جو حضورؐ کی تئیس سالہ نبوت کی زندگی میں جزءً جزءً نازل ہوتا رہا۔ اس سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ پر ہر وقت وحی نازل نہیں ہوا کرتی تھی۔ خود روایات بتاتی ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس وقت حضورؐ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوا کرتی تھی جو وحی کے ختم ہو جانے کے بعد باقی نہیں رہا کرتی تھی۔ جب حضورؐ پر وحی نازل ہو چکتی تو آپ فرماتے کہ یہ سورت یا یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ انھیں قرآن کے فلاں مقام پر رکھ لو۔ چنانچہ اسی وحی کو کاتبانِ وحی سے لکھوا دیا جاتا۔ اور حفاظ کو یاد کرا دیا جاتا۔ اس وحی کے بعد، دن رات کے باقی حصے میں

Marfat.com

حضورؐ جو کچھ ارشاد فرماتے، انھیں نہ کاتبانِ وحی سے لکھوایا جاتا نہ حفّاظ کو یاد کرایا جاتا۔ نہ حضورؐ کبھی یہ حکم دیتے کہ اسے قرآن کے فلاں مقام میں درج کر لو۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی اور حضورؐ کی باقی زندگی ایک دوسرے سے متمیز تھیں۔ وحی، اللہ کی طرف سے نازل ہوتی تھی۔ اسی کا مجموعہ قرآن ہے۔ اسی پر ایمان لانے کا حکم تھا۔ یہی لکھی جاتی تھی، اسی کو حفظ کرایا جاتا تھا۔ اسی کی اتباع خود رسول اللہؐ فرماتے تھے اور اسی کی اتباع اور مسلمانوں سے کراتے تھے نہ اس میں کسی غلطی کا امکان تھا نہ سہو نہ فروگذاشت کی گنجائش لیکن وحی کے علاوہ جو کچھ حضورؐ فرماتے تھے وہ منزل من اللہ نہیں ہوتا تھا بلکہ حضورؐ کی اپنی طرف سے ہوتا تھا اگرچہ حضورؐ بصیرتِ ایمانی کے بلند ترین مقام پر تھے اور آپ کی سیرتِ طیبہ مکارمِ اخلاق اور خُلقِ عظیم کا مظہراتم تھی۔ لیکن بشریت کے تقاضے بہرحال حضورؐ کے ساتھ تھے۔ حضورؐ کی زندگی کے ان دو حصّوں کو خود قرآن کریم نے متمیز کر کے دکھا دیا ہے جب فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی ...... "میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اِس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے کہ

وحی اور غیر وحی کا فرق

قل ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی. وان اھتدیت فبما یوحی الی ربی (۳۴/۵۰)

(ان سے کہو کہ اگر میں غلطی کروں تو اس کی ذمہ داری خود مجھ پر ہے۔

Marfat.com

اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس قرآن کی بدولت ہے

جو میرا رب میری طرف وحی کرتا ہے

لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ بھی غلط ہے۔ نبی اکرمؐ زندگی کے

رسولؐ، ہر حال میں رسول تھے!

ہر سانس میں رسول تھے، آپ کی ہر بات وحی ہوتی تھی۔ اس کا ایک حصہ قرآن میں درج کرا دیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ ویسے رہنے دیا جاتا تھا۔ یہ دوسرا حصہ کتب روایات میں ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

قرآن کریم میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول اور نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اس وقت سے لے کر، حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک، آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا...... حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے۔

(تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۴۱)

اس کے بعد آیۃ "وما ینطق عن الھویٰ" (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، آیات مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔

Marfat.com

یہ تصریح قرآن میں اس لئے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے...... وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے..... میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے"

(ایضاً ص ۲۴۳-۲۴۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

کتاب کے ساتھ رسول اللہؐ کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن استاد کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے، اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں (ص ۲۳۶)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) نبی اکرمؐ نے بعثت کے بعد جو بات جس وقت جس حالت میں بھی فرمائی وہ بحیثیت رسول کے تھی۔

(۲) حضورؐ کی ہر بات اسی طرح خدا کی طرف سے ہوتی تھی جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اور

(۳) ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ باتیں "غیر از قرآن" ہیں ہی نہیں۔

ایک اعتراض

ان تینوں مقدمات کو سامنے رکھ کر آگے بڑھتے۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر حضورؐ کی کہی ایک باتوں

Marfat.com

پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ٹوکا۔ چنانچہ ان کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے۔ مثلاً آپ نے ایک قسم کا شہد کھانے سے قسم کھائی تو ارشاد ہوا کہ

یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (سورہ تحریم)

اے نبی! جس کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے اسے تم کیوں حرام کرتے ہو؟

ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا اپنے اوپر شہد کو حرام قرار دے لینا من جانب اللہ تھا تو خدا نے اس پر اعتراض کیوں کیا؟ یعنی پہلے خدا نے خود ہی رسول اللہ سے کہدیا کہ شہد کو اپنے اوپر حرام کر لو۔ اور جب آپ نے اس حکم کی تعمیل کر لی تو پھر خود ہی اس پر تادیب بھی نازل کر دی؟

یا مثلاً دوسری جگہ ہے عفا اللہ عنک لم اذنت لھم (توبہ) "اے نبی! خدا نے تمہیں معاف کر دیا۔ تم نے انھیں اجازت کیوں دیدی تھی؟" اب ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا اجازت دے دینا از روئے وحی تھا تو اس پر وحی بھیجنے والے خدا نے تہدید کیوں فرمائی! اسی طرح ایک اور واقعہ میں قرآن میں آیا ہے کہ "عبس و تولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ" (سورہ عبس) یعنی "اے رسول تمہیں یہ بات بہت ناگوار گزری کہ وہ اندھا اس وقت تمہارے پاس کیوں آگیا۔ اس سے تمہاری پیشانی پر بل آگئے" سو اگر حضورؐ کی پیشانی پر بل وحی کے مطابق آتے تھے تو پھر وحی نے اس پر

Marfat.com

تنبیہ کیوں کی ؟

سنئے کہ اس کے جواب میں مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں لکھتے ہیں کہ

(رسول کے) معاملات کو اس کی بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ جہاں خدا کے مقرر کئے خط مستقیم سے اس نے بال برابر بھی جنبش کی ہے وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا۔ (صٓ۲۶۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

منصب نبوت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبی اکرمؐ کے لئے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی ٹھیک وحی الٰہی کے مطابق ہو۔ اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحی خفی کے اشارے کو نہ سمجھ کر مرضیٔ الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرے تو اللہ تعالیٰ وحی جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ (صٓ۲۷۵)

پھر ارشاد ہے:

اگر رسول بمقتضائے بشریت کبھی اپنے اجتہاد میں غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ (صٓ۲۶۷)

(۱) رسول خود اجتہاد فرمایا کرتے تھے۔

(۲) بمقتضائے بشریت اپنے اجتہاد میں غلطی بھی کر جاتے تھے۔

(۳) لیکن جہاں رسول اپنے اجتہاد میں غلطی کرتے تھے انہیں فوراً ٹوک دیا جاتا تھا

Marfat.com

(۴) وحی کی دو قسمیں ہیں وحی خفی اور وحی جلی۔ وحی خفی کے اشارات کو صحیح طور پر سمجھنے میں رسول سے سہو ہو جاتا تھا تو وحی جلی کے ذریعے اس کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔

اب اُن تین مفروضات کو سامنے لائیے جو پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے مقابل مندرجہ بالا نتائج کو رکھئے اور پھر تضاد ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) رسول اللہؐ کی ہر بات اسی طرح منجانب اللہ ہوتی تھی جس طرح قرآن منجانب اللہ تھا۔	(۱) رسول کے اجتہادات اپنی طرف سے ہوتے تھے جن میں غلطی بھی ہو جاتی تھی۔
(۲) رسول اللہ جس وقت جس حالت میں جو بات بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔	(۲) حضورؐ خدا کے متعین کردہ خط مستقیم سے جنبش کر جاتے تھے تو فوراً آپ کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔
(۳) حضورؐ کے اجتہادات اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔	(۳) قرآن وحی جلی ہے اور باقی وحی خفی۔

یہ نکتہ ذرا باریک ہے۔ اسے غور سے سمجھئے۔ اگر رسول اللہؐ کی ہر ایک بات منجانب اللہ تھی، اسی طرح جس طرح قرآن منجانب اللہ ہے تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حضورؐ اجتہادات میں غلطی کر جاتے تھے یا "وحی خفی" کا اشارہ سمجھنے میں سہو ہو جاتا تھا۔ جب حضورؐ کی ہر بات، ہر عمل، ہر فیصلہ منجانب اللہ تھا تو پھر اس میں

Marfat.com

غلطی کیسی اور "وحی خفی" کا اشارہ سمجھنے اور نہ سمجھنے کا سوال کیا؟ لیکن مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق خدا اور رسول میں معاملہ یوں تھا کہ:

(۱) رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی تھی۔
(۲) لیکن جب خدا دیکھتا کہ رسول فلاں معاملہ میں غلطی کر گیا ہے تو فوراً اُس کی اصلاح کر دیتا۔

اگر کسی کے سر میں ذرا بھی عقل سلیم ہے تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان دو باتوں میں کوئی ربط دکھائی دیتا ہے؟

پھر اس کے بعد دریافت طلب امر یہ ہے کہ مودودی صاحب نے وحی کی جو دو قسمیں ارشاد فرمائی ہیں (وحی خفی اور وحی جلی) تو اس تقسیم کا کوئی ذکر قرآن میں بھی ہے؟ یا (معاذاللہ) خود خدا بھی اپنی وحی کے متعلق نہیں جانتا تھا کہ اس کی دو قسمیں ہیں؟

خداداد بصیرت

اب آگے بڑھیے۔ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے عقیدہ کے مطابق، نبی اکرمؐ کی ہر بات

Marfat.com

وحی ہوتی تھی۔ لیکن وہ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:

"رسول کو درمیانی واسطہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امت کی عملی زندگی میں نافذ کرکے ایک نمونہ پیش کردیں اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لئے وہ طریقے متعین کردیں جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیے۔ (صفحہ ۲۳)

یعنی دین کے اصول قرآن کریم میں تھے اور رسول اللہؐ نے ان قوانین کو اپنی خداداد بصیرت سے عملاً متشکل کرکے دکھایا۔ اوپر کہا گیا تھا کہ رسول اللہؐ نے یہ کام وحی کے ذریعے کیا تھا لیکن یہاں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے اسے اپنی خداداد بصیرت سے کیا تھا۔ اگر منجانب اللہ وحی اور خداداد بصیرت، دو الگ الگ چیزیں ہیں تو مودودی صاحب کا تضاد واضح ہے، لیکن اگر مودودی صاحب کے نزدیک منزل من اللہ وحی، بصیرت ہی کا دوسرا نام ہے تو یہ عقیدہ غور طلب ہے۔ بصیرت کم و بیش ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ یعنی یہ خاصہ مافوق البشر نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کی بصیرت دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے تو یہ فرق کمیت (Quantity) کا ہوا، کیفیت Quality کا نہ ہوا۔ اس سے یہ لازم آئے گا کہ بصیرت اور وحی میں فرق Quantitative ہے Qualitative نہیں۔

Marfat.com

نوع کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی وحی، بصیرت ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ یہ تصوّر برگسان کے ہاں تو ضرور ملتا ہے لیکن قرآن کی رُو سے ایسا تصوّر غلط ہے۔ قرآن وحی کو ایک الگ خاصہ قرار دیتا ہے جس میں رسول کے علاوہ کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا۔ لہٰذا وحی اور بصیرت مستقلاً دو الگ الگ خاصے ہیں بسو، اگر رسول کے اجتہادات بذریعہ وحی ہوتے ہیں تو ان میں رسول کی اپنی بصیرت کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور اگر وہ رسولؐ کی بصیرت کا نتیجہ ہوتے ہیں تو وہ وحی نہیں ہوتے۔

مودودی صاحب دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"قرآن ۲۳ سال کی مدّت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہو اسی طرح احادیث میں حضورؐ کے وہ اقوال جمع کیے گئے ہیں جو ۲۳ سال کے طویل زمانہ میں آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حالات میں حسب ضرورت ارشاد فرمائے۔ (ص ۱۵۹)

لیجیے! یہاں قرآن اور احادیث کا فرق خود سامنے آ گیا۔ قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں حضورؐ پر نازل ہوا تھا اور احادیث وہ اقوال ہیں جو رسول اللہ نے حسب ضرورت ارشاد فرمائے۔

لیکن آگے چل کر پھر اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ان آیات میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اس کے متعلق

Marfat.com

کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے اور کتاب کے سوا کوئی وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی لیکن یہ خیال قطعًا غلط ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاءِ کرامؑ پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کیجاتی بلکہ ان کی ہدایت اور راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا ہے اور اسی وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے ہیں۔

(صٓ ۲۷۴)

پہلے لکھا تھا کہ "احادیث وہ اقوال ہیں جو رسول اللہؐ نے حسبِ ضرورت ارشاد فرمائے"۔ اب فرماتے ہیں کہ نہیں احادیث رسول اللہؐ کے اقوال نہیں ہیں بلکہ یہ بھی منجانب اللہ وحی ہیں۔

وحی کی دو قسمیں

مودودی صاحب نے یہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ "قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی بلکہ ان کی ہدایت اور راہ نمائی کیلئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا ہے"۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس دعوے کی دلیل میں آپ نے قرآن سے کونسی سندات پیش کی ہیں؟ سن لیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت نوحؑ سے فرمایا کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کرو۔ حضرت یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے طور پر باتیں کی جاتی ہیں جن میں آپ کی بکریوں اور لاٹھی کا تذکرہ بھی ہے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا جاتا ہے اور تمام ہدایات دی

Marfat.com

جاتی ہیں کہ وہ کس طرح بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر نکل آئیں۔ ان واقعات کے تذکرہ کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

"کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایت عام کے لئے نازل ہوئی ہو؟ یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء کی طرف اللہ ہمیشہ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کی غلطی کا امکان ہو اپنی وحی سے ان کی راہ نمائی کرتا رہتا ہے اور یہ وحی اس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایت عام کے لئے ان کے واسطے سے بھیجی جاتی اور کتاب میں درج کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لئے ایک الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے۔"
(ص ۲۴۵)

سب سے پہلے تو یہ امر دریافت طلب ہے کہ مودودی صاحب کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ باتیں جن کا ذکر انھوں نے فرمایا ہے، ان انبیاء کرامؑ کی کتابوں میں درج نہیں تھیں۔ یہ ان کا محض قیاس ہے اور قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ یہ باتیں ان انبیاء کرام کی ذات سے متعلق تھیں اور "ہدایت عام" کے لئے نازل نہیں ہوئی تھیں، اس لئے انھیں انکی کتابوں میں درج نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم اس دلیل کی کس طرح تردید کر رہا ہے۔ کئی ایک واقعات ایسے تھے جن کا تعلق نبی اکرمؐ کی ذات سے تھا لیکن بایں ہمہ وہ قرآن میں درج ہیں۔ مثال کے طور پر

Marfat.com

حضورؐ کی ازواج مطہرات کے ضمن میں سورۃ احزاب کی وہ آیات ملاحظہ کیجئے جن میں ارشاد ہے کہ

اے نبی! ہم نے تیرے لئے وہ بیویاں جائز کر دیں جنھیں تو نے ان کے مہر دیدیئے ہیں اور جس کا تیرا دایاں ہاتھ مالک ہو (اس سے جو اللہ نے تجھ پر (کفار سے) لوٹایا اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں، جنھوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی اور مومن عورت اگر وہ اپنے آپ کو نبی کو ہبہ کر دے اگر نبی اس سے نکاح کا ارادہ کرے۔ (۳۳/۵۰)

یہ احکام نبی اکرمؐ کی ذات سے متعلق تھے۔ ان کے اخیر میں قرآن نے تصریح کر دی تھی کہ خالصۃ لک من دون المؤمنین (۳۳/۵۰) "یہ صرف تیرے لئے حکم ہے، مومنین کے لئے نہیں"! غور کیجئے جس حکم کے متعلق خود اللہ نے تصریح کر دی ہے کہ وہ صرف نبی اکرمؐ کی ذات کے لئے تھا، مومنین کے لئے نہیں تھا۔ وہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ پھر اس کے بعد کی آیات بھی دیکھئے جن میں مذکور ہے کہ "اس کے بعد تیرے لئے اور عورتیں نکاح میں لانا جائز نہیں اور نہ ہی موجودہ بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں نکاح میں لانا"۔ (۳۳/۵۲) یہ حکم بھی خاص رسول اللہؐ کے لئے تھا۔ اسی طرح سورۃ تحریم میں دیکھئے جہاں اللہ نے وہ واقعہ بھی درج قرآن کر دیا جس میں رسول اللہؐ کی ایک بیوی نے کوئی راز کی بات دوسری (بیوی) سے کہہ دی تھی اور اللہ نے ان سے کہا تھا کہ

Marfat.com

تمہیں توبہ کرنی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ بھی خالص رسول اللہؐ کے ذاتی معاملات سے متعلق تھا، بایں ہمہ یہ بھی درجِ کتاب ہے۔ تہجد کے متعلق قرآن کریم نے خود ہی کہدیا کہ " نافلۃ لک " یہ صرف (اے رسول) تیرے لئے اضافہ ہے، دوسروں کے لئے نہیں۔ یہ حکم جو صرف رسول اللہؐ کے لئے مختص تھا، قرآن میں درج ہے۔ لہٰذا مودودی صاحب کا بیان فرمودہ یہ اصول بھی غلط ہے کہ جو باتیں " عام ہدایت کے لئے نہیں ہوتی تھیں " وہ درجِ کتاب نہیں کی جاتی تھیں[1]۔ اگر یہ کہدیا جائے کہ ان باتوں سے عام ہدایت مقصد ہے تو پھر حضرت نوحؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کی جن باتوں کا ذکر مودودی صاحب نے فرمایا ہے، کیا ان سے عام ہدایت مقصود نہیں ہوسکتی؟ علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق وہ باتیں ان انبیاء کرامؑ کی کتابوں میں درج ہونے کے قابل تو نہ تھیں کیونکہ ان سے ہدایت عامہ مقصود نہ تھی، لیکن انہی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں درج کردیا جو قیامت تک کے انسانوں کے لئے عام ہدایت کی کتاب ہے۔ ایسا تو ہوسکتا تھا کہ کوئی بات انبیائے سابقہ کی کسی کتاب میں ہوتی اور

---

[1] واضح رہے کہ ہم اس وقت مودودی صاحب کے پیش کردہ اصول پر بحث کر رہے ہیں ورنہ ہمارے نزدیک ہر وہ چیز جو قرآن میں درج ہے نوعِ انسانی کے لئے باعثِ ہدایت ہے۔

Marfat.com

قرآن میں اسے درج نہ کیا جاتا کیونکہ وہ اُسی زمانے کے لئے تھی۔ لیکن یہ واقعہ عجیب ہے کہ ایسی باتیں جو اُس زمانے کے لوگوں کی ہدایت کے لئے تو نہ تھیں اس لئے ان انبیاء کرام کی کتابوں میں درج نہ کی گئیں، انھیں ہزارہا سال بعد، قرآن کریم میں درج کر دیا گیا؟ ہم یہ کچھ لکھ رہے ہیں اور ہمارا دل دکھ رہا ہے کہ ان لوگوں نے کس طرح قرآن کو کھیل بنا رکھا ہے!

لیکن ہم کہتے ہیں کہ مودودی صاحب کے اس بیان کے مطابق، سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"یہ وحی اُس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایت عام کے لئے (انبیاء کی) وساطت سے بھیجی جاتی ہے اور کتاب میں درج کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لئے ایک الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) ایک وحی وہ ہوتی تھی جو ہدایت عام کے لئے نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف رسول کی اپنی ہدایت کے لئے ہوتی تھی۔ اس لئے کتاب میں درج نہیں کی جاتی تھی۔ اور

(۱۱) دوسری وحی ہدایت عام کے لئے ہوتی تھی اور کتاب میں درج کی جاتی تھی "تاکہ لوگوں کے لئے الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے"

پہلی قسم کی وحی جس کا تعلق نبی اکرمؐ کی ذات تک تھا، حضورؐ کی وفات سے

Marfat.com

ختم ہو گئی۔ اب نوعِ انسانی کے لئے الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل دوسری قسم کی وحی ہے، جو قرآن کریم میں درج ہے۔ یہی ہم کہتے ہیں کہ نوعِ انسانی کے لئے ہدایت نامہ اور دستور العمل خدا کی کتاب ہے۔ یہ بحث کہ رسول اللہ کی اپنی ہدایت کے لئے اس سے الگ وحی ہوتی تھی یا نہیں، محض نظری ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے لئے بھی الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل یہی قرآن تھا کیونکہ قرآن میں بالتصریح حکم ہے کہ رسول اللہؐ اسی کا اتباع کریں اور اسی سے ہدایت حاصل کریں۔ لیکن اگر مودودی صاحب قرآن کے اس واضح ارشاد کے علی الرغم یہی ماننے پر مصر ہیں کہ نہیں! قرآن ہماری ہدایت کے لئے ہے اور رسول اللہؐ کی ہدایت کے لئے ایک اور وحی ہوتی تھی، تو انھیں کون مجبور کرسکتا ہے کہ وہ ضرور قرآن ہی کا ارشاد مانیں؟ لیکن یہاں تک تو وہ بھی متفق ہیں کہ عام ہدایت کے لئے، الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل وہی وحی ہے جو قرآن میں درج ہے۔ وہو المراد!

ہر بات وحی نہیں ہوتی تھی

بہر حال، مودودی صاحب کو اصرار ہے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی اور وحی کی دو قسمیں ہوا کرتی تھیں۔ آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ کیا صحابہ کبارؓ کو بھی اس کا علم تھا کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی پر مبنی ہوتی

Marfat.com

ہے اور وحی کی دو قسمیں ہیں یا وہ بھی اس رازِ درونِ پردہ سے (معاذ اللہ) بے بہرہ تھے۔ نہیں! اور آگے بڑھئے کہ کیا خود ذاتِ رسالتمآبؐ کو بھی اس حقیقت کا علم تھا کہ حضورؐ کی ہر بات وحی ہوتی ہے اور اس وحی کی دو قسمیں ہیں یا (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) آپؐ بھی اس سے بے خبر تھے!

مودودی صاحب کے اس دعوے کو پھر دُہرا لیجئے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی۔ حضورؐ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں فرماتے تھے۔ جو کچھ کرتے تھے، وحی کے مطابق کرتے تھے۔ اس وحی میں سے ایک حصہ درجِ کتاب ہو جاتا تھا اور دوسرا حصہ ویسے رہنے دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دو چار واقعات کو سامنے لائیے۔

> حضرت حباب بن منذر نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے"۔ حباب نے کہا "تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے"۔ آپ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اس پر عمل کیا گیا۔ (سیرت النبی، علامہ شبلی۔ حصہ اول ص ۲۹۵)

مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق (کہ حضورؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی) حضورؐ کا انتخاب مقام، وحی کی رُو سے تھا۔ لیکن حضرت حبابؓ دریافت فرماتے ہیں کہ آیا یہ انتخاب وحی کی رُو سے ہے یا فوجی تدبیر کے مطابق۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت حبابؓ کو اس کا علم نہیں تھا کہ حضورؐ کی ہر بات وحی

Marfat.com

ہوتی ہے۔ اس پر رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ نہیں، یہ وحی کی رُو سے نہیں ہے۔

اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) یا تو (معاذ اللہ) رسول اللہؐ کو بھی وہ بات معلوم نہ تھی جو مودودی صاحب کو معلوم ہے۔ اور

(۲) اگر رسول اللہؐ نے سچ فرمایا ہے (اور کون کمبخت ہے جو رسول اللہؐ کے متعلق بھی یہ گمان کرے کہ (پناہ بخدا) حضورؐ نے سچ نہیں فرمایا تھا) تو پھر جو کچھ مودودی صاحب فرما رہے ہیں اس کے متعلق خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ وہ کیا ہوا؟

اور دیکھئے۔ جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق

آنحضرتؐ نے مدینہ میں آکر مشورہ کیا کہ ان کے معاملہ میں کیا کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لیکر چھوڑ دیئے جائیں لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست، دشمن، عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیئے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو قتل کرے۔ آنحضرتؐ نے صدیق اکبرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری:

لولا کتاب من اللہ ....

(اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر

Marfat.com

بڑا عذاب نازل ہوتا) آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتاب ربّانی سن کر رو پڑے[1] (ایضاً صفحہ ۳۰)

اب دیکھئے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، بات کیا ہوئی:

(i) جنگ کے قیدیوں کے متعلق حضورؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ [اگر رسولؐ کی ہر بات وحی کی رُو سے ہوتی تھی تو حضورؐ کو مشورہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟]

(ii) حضورؐ نے مشورہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند فرمائی اور اسی کے مطابق عمل کیا۔ ظاہر ہے کہ (مودودی صاحب کے بیان کے مطابق) حضورؐ کا یہ عمل وحی کی رُو سے تھا۔

(iii) اس پر خدا نے عتاب نازل فرمایا۔ یعنی پہلے تو خود ہی خدا نے وحی کے ذریعے یہ کہدیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے اختیار کر لو اور جب آپ نے وہ رائے اختیار کر لی تو پھر آپ پر عتاب نازل کر دیا۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ)

افک حضرت عائشہؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ منافقین کی بہتان طرازی کے بعد آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی درخواست پر انھیں اُن کے میکے بھیجدیا اور خود وحی کا انتظار فرماتے رہے۔ اس دوران میں حضورؐ نے لوگوں سے مشورہ بھی

---

[1] علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عتاب مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق تھا۔ لیکن یہ چیز تو اپنی جگہ پر موجود رہتی ہے کہ حضورؐ کے ایک فیصلہ پر اللہ کی طرف سے ایسا عتاب نازل ہوا کہ حضورؐ رونے لگے۔

Marfat.com

کیا۔ چنانچہ قریب ایک ماہ کے بعد جب وحی نے حضرت صدیقہؓ کی پاکدامنی کی تصدیق کر دی تو حضورؐ نے انھیں بشارت دی یعنی مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق پہلے اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعے یہ کہدیا کہ حضرت عائشہؓ کو ان کے میکے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ پھر لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم بھی وحی خفی کے ذریعے سے دیا۔ اس کے بعد وحی جلی سے اعلان کر دیا کہ حضرت عائشہؓ پاکدامن ہیں!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

اور سُنیئے! عرب ایک خاص موسم میں کھجور کے درختوں میں گابھا لگایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ یوں نہ کرو، یوں کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجوروں میں پھل نہ آیا، یا بہت کم آیا۔ یعنی یہ تجربہ ناکام رہا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

> میں نے صرف ایسا گمان کیا تھا۔ تخمینی بات کا مجھ سے مواخذہ نہ کرو۔ لیکن جب میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو اس کو اختیار کرو۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

یعنی مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی اور رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ بعض باتیں میں اپنے گمان کی رُو سے کہتا ہوں اور بعض خدا کی جانب سے جو باتیں میں اپنے ظن و تخمین کی بنا پر کہتا ہوں وہ

Marfat.com

غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ انھیں اختیار نہ کیا کرو۔ بلکہ یہاں تک بھی کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ دنیاوی معاملات تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔

اور دیکھئے! مقدمات کا فیصلہ رسول اللہؐ کے اہم فرائض میں سے تھا اگر رسول اللہ کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی تو ظاہر ہے کہ ہر مقدمہ کا فیصلہ جو رسول اللہؐ فرماتے تھے، وحی کی رو سے ہوتا تھا، فلہٰذا جھوٹ اور سچ نکھر کر الگ الگ ہو جاتا تھا۔ لیکن سنئے کہ خود رسول اللہؐ اس باب میں کیا فرماتے ہیں

"حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پاس اہل مقدمہ آتے ہیں اور ممکن ہے کہ بعض آدمی بہ نسبت دوسروں کے زیادہ چرب زبان ہوں۔ چونکہ میں بھی انسان ہوں۔ اس لئے شاید میں اس کو سچا جاننے لگوں اور اس کے موافق فیصلہ دیدوں۔ لہٰذا اگر میں کسی مسلمان کے حق میں ڈگری دے دوں تو اس کو آگ کا ٹکڑا سمجھنا چاہیئے۔ چاہے لے لے چاہے چھوڑ دے۔ (بخاری کتاب المظالم)

رسول اللہؐ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ نہیں حضورؐ کے تمام فیصلے وحی کی رو سے ہوا کرتے تھے!

یا مثلاً حضرت زیدؓ کا واقعہ دیکھئے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ نبی اکرمؐ حضرت زیدؓ سے فرماتے ہیں کہ امسك عليك زوجك۔ اپنی بیوی طلاق مت دو۔ اس پر حضرت زیدؓ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ حکم وحی کا ہے یا آپؐ کا ذاتی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں، حضرت زیدؓ نے اس حکم کے

Marfat.com

باوجود اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق دیدی اور اس سے نہ خدا ناراض ہوا نہ خدا کا رسول، ورنہ ظاہر ہے کہ وحی کے حکم کی اس طرح کھلی ہوئی مخالفت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

یا اذان کا واقعہ لیجئے۔ صلوٰۃ کے لئے "منادی" کا ذکر قرآن میں موجود ہے لیکن اس کی تصریح نہیں کہ یہ منادی کس انداز کی ہوگی۔ مروّجہ اذان کس انداز سے اختیار کی گئی؟ رسول اللہؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ کسی نے کچھ مشورہ دیا کسی نے کچھ۔

> آنحضرتؐ نے کسی مشورہ کو پسند نہ فرمایا۔ دوسرے دن حضرت عمر فاروقؓ نے آکر عرض کیا کہ انھوں نے خواب میں ان الفاظ کو سنا ہے جو اب اذان میں کہے جاتے ہیں۔ نبی اکرمؐ نے انہی الفاظ کو بآواز بلند پکارنے کو فرمادیا۔
>
> (رحمۃ اللعالمین۔ حصہ اوّل صؔ ۱۴۳)

غور فرمائیے، اذان کا معاملہ کوئی "نجی" معاملہ نہیں بلکہ خالص دین کا معاملہ ہے۔ اس کے لئے "وحی خفی" کچھ نہیں بتاتی۔ نبی اکرمؐ صحابہؓ سے مشورہ فرماتے ہیں۔ پہلے روز کوئی موزوں بات سامنے نہیں آتی تو معاملہ کو ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ پھر دوسرے روز حضرت عمرؓ کی رائے کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی کی رُو سے ہوتی تھی۔

Marfat.com

یہ سوال کہ اگر رسول اللہ کی ہر بات وحی سے ہوتی تھی تو آپؐ صحابہؓ سے مشورہ کیوں کیا کرتے تھے، بڑا اہم ہے۔ واضح رہے کہ یہ مشورہ محض آپ کی مرضی پر منحصر نہ تھا بلکہ خدا نے حکم دیا تھا کہ وشاورھم فی الامر "معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو" یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کو حکم دیتے ہیں کہ معاملات باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔ رسول اللہؐ اس حکم کے مطابق صحابہؓ سے برابر مشورہ فرماتے رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان باتوں میں نہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی تھی نہ رسول اللہؐ اپنی بات کو وحی سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ اگر رسولؐ کی ہر بات وحی ہوتی تو پھر مشورہ سے کیا مطلب؟ لیکن دیکھئے مودودی صاحب اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"بلاشبہ رسول اللہ کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس لئے تھا کہ آپ اپنی امت کے لئے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت کے صحیح اصول کی طرف راہنمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ آپ کی حیثیت دوسرے اُمراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کیلئے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں۔ وامرھم شوریٰ بینھم اور یہ کہ اگر اہل شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کریں۔ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ و الرسول۔ لیکن رسول اللہؐ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے

Marfat.com

وہیں یہ بھی کہدیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو پھر خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام فرمائیے۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو مشورہ کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد پڑجائے۔ (ایضاً ص ۲۹۵)

سردست ان تمام مباحث کو الگ رکھ دیجئے کہ آپ کی اور دیگر امراء کی حیثیت میں کیا فرق تھا۔ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ سے کیا مراد ہے[1]۔ اس وقت صرف اس توجیہہ کو لیجئے جو مودودی صاحب کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ یہ واضح ہے کہ:۔

(i) اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کو حکم دیا کہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کیا کرو۔

(ii) رسول اللہؐ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے۔

(iii) ان مشوروں پر عمل ہوتا رہا۔

(iv) بعض باتیں جو مشورہ کی رُو سے اختیار کی گئیں، اللہ کی منشا کے مطابق نہ نکلیں اس لئے خدا کی وحی نے ان پر تنبیہ کی۔ لیکن مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ حضورؐ مشاورت کے محتاج نہ تھے۔ یہ حکم محض اس لئے دیا گیا تھا

---

[1] ان آیات کی تشریح کے لئے دیکھئے "اسلامی نظام" شائع کردہ طلوع اسلام۔

Marfat.com

کہ آپ کے ہاتھوں جمہوریت کی بنیاد رکھ دی جائے۔ سوال یہ نہیں کہ آپؐ مشورہ کے محتاج تھے یا نہیں تھے۔ سوال یہ ہے کہ آپؐ کو مشورہ کا حکم دیا گیا تھا یا نہیں، آپ مشورہ کیا کرتے تھے یا نہیں! اگر ان باتوں کا جواب اثبات میں ہے تو پھر اس الجھن کا کیا حل ہے کہ رسول اللہؐ کی ہر بات وحی ہوتی تھی لیکن آپؐ کیا وہ کرتے تھے جو مشورہ سے طے پاتا تھا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی ربط، کوئی تعلق، کوئی واسطہ بھی ہے؟ غالباً مودودی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ مشورہ کے محتاج نہ تھے لیکن (معاذاللہ) محض دکھانے کے لئے مشورہ فرما لیا کرتے تھے۔ تاکہ اُمت میں طرز جمہوری کی بنیاد آپؐ کے مبارک ہاتھوں سے پڑ جائے لیکن پھر وہی دشواری سامنے آجائے گی کہ:-

(i) اگر آپؐ (معاذاللہ) محض دکھانے کے لئے مشورہ فرمایا کرتے تھے (تاکہ جمہوریت کی بنیاد رکھ دی جائے) تو پھر ایسا مشورہ قبول کیوں فرماتے تھے جس پر وحی کی رو سے تنبیہ بھی آجاتی تھی۔ اور

(ii) اگر آپ صحیح معنوں میں مشورہ فرماتے تھے اور مشورہ قبول بھی کرتے تھے حالانکہ بعض اوقات وہ مشورہ منشاء خداوندی کے خلاف بھی ہوتا تھا، تو پھر یہ دعویٰ کس طرح صحیح ہو گا کہ آپ کی ہر بات وحی ہوتی تھی؟

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کی یہ توجیہ نہ صرف یہ کہ کس قدر بے معنیٰ ہے بلکہ یہ بھی کہ اس سے خود خدا اور اس کے رسولؐ کے متعلق کیا تصور ذہن میں

Marfat.com

قائم ہوتا ہے؟

بہر حال مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ:۔

(i) ایک قسم کی وحی سے اللہ تعالیٰ دین کے اصولی احکام نازل کیا کرتا تھا اور یہ وحی کتاب میں درج ہو جاتی تھی اور

(ii) اس کے بعد دوسری قسم کی وحی سے ان احکام کی تفاصیل نازل کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ وحی کتاب میں درج نہیں ہوتی تھی اگرچہ یہ بالکل قرآن کے ہم پایہ اور اس کے مثل ہوتی تھی۔

(iii) یہ سب کچھ یعنی تدوین جزئیات، وحی کی رو سے، بہ حیثیت رسالت ہوتا تھا اور چونکہ رسول کی اطاعت شرط اسلام ہے اس لئے ان تمام امور کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے۔

یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت لاحق ہوتی کہ

وحی خفی قرآن میں کیوں نہ رکھ دی گئی؟

اس نے اپنی وحی کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جب دونوں چیزیں (اصول اور ان کی تفاصیل) منجانب اللہ تھیں، ایک ہی رسول پر نازل ہوتی تھیں، اور دین ان دونوں کے مجموعے کا نام تھا۔ دونوں کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہنا تھا۔ تو انھیں ایک ہی جگہ (قرآن میں) کیوں نہ رکھا گیا؟ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تم نہیں جانتے

Marfat.com

کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ سنو۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ تفصیلاتِ نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں کیوں فریضۂ اولیں قرار دی جائیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ کی بتائی ہوئی تفصیلاتِ نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہرِ فنِ طبیب، فنِ طب کے کسی قاعدے کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے خارج از فن نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو شکلیں کھینچ کر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اسے غیر از اقلیدس نہیں کہہ سکتے[1]۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور مہماتِ مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں اور عملی تفصیلات استاد[2] کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں کیونکہ استاد عملی مظاہرہ سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لئے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ پھر کتاب کے حُسنِ کلام اور اس کے کمالِ ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم و فنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل

---

[1] لیکن آپ اسے اقلیدس کی تصنیف بھی قرار نہیں دے سکتے۔ اقلیدس کی طرف سے وہی ہے جو اُس نے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔

[2] باایں ہمہ مصنف مصنف رہتا ہے اور استاد، استاد۔

Marfat.com

کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بتاتا۔ رکعتوں کی تفصیل بتاتا۔ رکوع و سجود و قیام کی سورتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا، بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر سورت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا۔ پھر تکبیر تحریمہ سے لیکر سلام تک نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا وہ بھی لکھتا اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لئے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درج کتاب کر دیئے جاتے اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ غیر از قرآن نہ ہو۔ لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا یا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔" (ص ۳۳۳-۳۳۶)

غور فرمایا آپ نے اللہ تعالیٰ کی اس "حکمتِ بالغہ" پر جس کی رُو سے اس نے اپنی وحی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا اور مسلمانوں کو اس بوجھ سے بچا لیا

Marfat.com

جو اس تمام وحی کو ایک جلد One Volume میں منضبط کرنے سے انھیں اٹھانا پڑتا! مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں کو اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اپنی ساری وحی کو ایک ہی جلد میں درج نہیں کر دیا ورنہ یہ ضعیف و ناتواں بندے اس کے بوجھ سے دب کر مرجاتے!

جی تو چاہتا ہے کہ مودودی صاحب کی بیان کردہ "حکمتِ بالغہ" کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے لیکن عدم گنجائش تفصیل و اطناب سے مانع ہے اس لئے اختصار پر قناعت کی جاتی ہے. قرآن میں (مثلاً) جتنی مرتبہ صلوٰۃ کی تاکید کی گئی ہے اگر ان تمام مقامات کو یکجا کیا جائے تو وہ ایک پارہ کے حجم سے کم نہ ہوں گے۔ اس تاکید کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے ضخامت کا خیال نہ کیا لیکن اس کی جزئیات کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس سے ضخامت بڑھ جانے کا ڈر تھا۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کی جزئیات تو بیان نہ فرمائیں لیکن وضو کی تفصیل درجِ کتاب کر دی۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق دیکھئے۔ تاکیدی احکام کو اکٹھا کیجئے تو ایک اچھی خاصی سورت سے کم نہ ہونگے لیکن سارے قرآن میں اس کے نصاب کا ذکر تک نہیں۔ ان کے برعکس نکاح، طلاق، عدت وغیرہ کے احکام دیکھئے تو چھوٹی چھوٹی سی تفاصیل بھی قرآن میں مذکور ہیں۔ حتیٰ کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت تک بھی۔ معاشرتی احکام کو دیکھئے تو اس قسم کے امور کی تفاصیل بھی موجود ہیں کہ گھروں

Marfat.com

ہیں کس طرح آنا چاہیئے۔ کس کس کے ہاں سے کھانا چاہیئے۔ باہر والوں کو آواز کس طرح دینی چاہیئے۔ اندر سے چیزیں کس طرح مانگنی چاہئیں۔ مجلس میں کس طرح بیٹھنا چاہیئے کس کے ہاں کھانا کھا کر جلدی اُٹھ آنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے برعکس ایسے ایسے اہم معاملات کی تفاصیل کہیں نہیں دی گئیں کہ امیرِ اُمّت کا انتخاب کس طرح ہونا چاہیئے مشاورت کا طریق کیا ہونا چاہیئے حکومت کی شکل کس انداز کی ہونی چاہیئے اور دیکھیئے قرآن میں زنا اور سرقہ کی سزاؤں کا ذکر موجود ہے لیکن شراب کی سزا کہیں متعین نہیں کی گئی! سوچیئے کہ اس سے قرآن کی ضخامت پر کیا اثر پڑ جاتا یا مثلاً قرآن میں ہے کہ ہر شخص اپنے مال میں وصیت کر سکتا ہے لیکن احادیث کی رُو سے یہ وصیت صرف تہائی حصہ میں ہو سکتی ہے۔ مودودی صاحب کے ارشاد کی رُو سے اگر "تہائی حصہ" کے الفاظ قرآن میں درج کر دیئے جاتے تو اس کی ضخامت بڑھ جاتی۔ یا مثلاً قرآن میں زانی اور زانیہ کی سزا سو سو کوڑے ہیں۔ لیکن حدیث میں ہے کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا سنگسار ہے۔ سوچیئے کہ اتنے الفاظ کے اضافے سے قرآن کا حجم کس قدر بڑھ جاتا! مودودی صاحب احکام کی تفصیل سے گھبراتے ہیں لیکن قرآن کے ایجاز کا تو یہ اعجاز ہے کہ اس نے وراثت کے احکام چار آیات میں درج کر دیئے ہیں اور اس جامعیت کے ساتھ کہ وراثت کے متعلق کوئی تفصیل ایسی نہیں جو ان چار آیتوں میں سمٹ کر نہ آگئی ہو لیکن

Marfat.com

انہی چار آیتوں کی تفصیل جب روایات کی رُو سے ہوئی تو سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذاللہ) چوتھی جماعت کے طالب علم جتنا حساب بھی نہیں آتا۔

ہم نے بغرض اختصار یہ چند مثالیں اس ضمن میں پیش کر دی ہیں کہ مودودی صاحب کی یہ توجیہ کہ ان تفصیلی احکام کو اس لئے درجِ قرآن نہیں کیا گیا کہ اس سے ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا کس قدر طفلانہ ہے۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب قرآن اور حدیث دونوں وحی ہیں تو قرآن کو مختصر رکھنے سے فائدہ کیا ہوا جب اس کا دوسرا حصہ (احادیث) اس قدر ضخیم ہوگیا؟

مودودی صاحب کی توجیہ کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام تفاصیل بھی درج قرآن کر دیتا تو "وہ تمام فوائد باطل ہوجاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں"۔ یہی ہم کہتے ہیں کہ جب آپ لوگوں نے قرآن کے اصولی احکام کی تمام تفاصیل کو بھی منزل من اللہ (وحی) قرار دیدیا تو اس سے "وہ تمام فوائد باطل ہو گئے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہونے تھے"۔ وہ فوائد یہی تھے کہ قرآن، اصولی کتاب تھا جس

Marfat.com

کی فروعات زمانہ کے ساتھ ساتھ ضروریات کے مطابق بدلتی رہتی تھیں جب آپ نے ان فروعات کو بھی وحی قرار دیکر قیامت تک کے لئے غیر متبدل ٹھہرا دیا تو قرآن کو کتاب اصول رکھنے کے تمام فوائد باطل ہو گئے۔ لیکن مودودی صاحب کی منطق ملاحظہ ہو کہ اگر وحی (جلد اوّل) اور وحی (جلد دوم) کو الگ الگ دو جلدوں میں رکھا جاتے تو تمام فوائد برقرار رہ جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں جلدوں کو یکجا کر دیا جاتا تو یہ تمام فوائد باطل ہو جاتے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است!

واضح رہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، قرآن کے اصول اور رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفاصیل دونوں منزل من اللہ (وحی) ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو الگ الگ رکھنا ایسا ہی ہے جیسے ضخامت بڑھ جانے کے خوف سے ایک کتاب کو دو جلدوں Volumes میں شائع کر دیا جاتے۔ ایک جلد میں اصول ہیں اور دوسری جلد میں ان اصولوں کی تفصیلات۔ دونوں منزل من اللہ۔ یا مودودی صاحب کے الفاظ میں، ایک تصنیف ہے اور دوسری اس تصنیف کی اُستادانہ شرح لیکن یہ شرح بھی منجانب اللہ ہے۔ عدم گنجائش پھر مانع ہے کہ ہم شرح وبسط سے بتا سکیں کہ اس تصنیف اور اس کی شرح میں کس قدر باہمی تضاد ہے۔

Marfat.com

سرِدست چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ تصنیف (قرآن کریم) میں ہے کہ

وحی جلی اور وحی خفی میں تضاد

زانی مرد اور زانی عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے بطور سزا لگاؤ۔ لیکن اس کی شرح (حدیث) کہتی ہے کہ نہیں۔ زانی اور زانیہ اگر غیر شادی شدہ ہیں تو کوڑے لگاؤ اور اگر شادی شدہ ہیں تو انھیں سنگسار کرو۔

وحی جلی (قرآن) کہتا ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو فدیہ دے کر آزاد کر دو یا بطور احسان لیکن اس کے بعد اُسی خدا کی طرف سے وحی خفی آتی ہے کہ نہیں! جنگ کے قیدیوں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں اور ان لونڈیوں کو بلا حدو شمار اپنے حرم میں داخل کر لو۔

وحی جلی (قرآن) کہتا ہے کہ انسان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہے۔ جس کا جی چاہے اسلام لے آئے، جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ نہیں! اگر کوئی مسلمان اسلام چھوڑ دے تو اس کی سزا قتل ہے۔

وحی جلی کہتی ہے اور بار بار کہتی ہے کہ تم اپنے مال کو وصیت کی رُو سے تقسیم کر سکتے ہو۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہوگی اور وہ بھی وارث کے لئے نہیں۔

Marfat.com

وحی جلی کہتی ہے کہ یتیموں کا خاص طور پر خیال رکھا کرو۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ اگر کوئی بچہ اپنے دادا کی زندگی میں یتیم ہو جائے تو اسے دادا کی میراث میں سے ایک پائی بھی نہ دو۔ تمام کی تمام جائداد اُن بچوں کو دے دو جن کا باپ زندہ ہے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ یہ چار چیزیں ہیں جنہیں خدا نے حرام قرار دیا ہے لیکن وحی خفی حرام اور حلال کی طول طویل فہرستیں مرتب کر کے دیتی ہے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا نے رسول اللہؐ کو صرف قرآن بطور معجزہ دیا ہے۔ دین کی تبلیغ علیٰ وجہ البصیرت ہوگی، حسّی معجزات کی بناء پر نہیں وحی خفی کہتی ہے کہ رسول اللہؐ کو سینکڑوں (بلکہ ہزاروں) حسّی معجزات عطا ہوتے تھے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ اللہ کے رسول سچے ہوتے ہیں وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ یہ غلط ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ بھی ایسا جس کے احساس سے وہ (معاذاللہ) روزِ محشر خدا کے حضور جانے سے نادم ہوں گے۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن کریم) کا ہر حکم اپنی جگہ محکم مستقل اور ابدی ہے۔ لیکن وحی خفی کہتی ہے کہ نہیں، اس میں بہت سے احکام ایسے ہیں جو منسوخ ہو چکے ہیں اور یونہی برائے وزنِ بیت اس میں رہنے دیئے ہیں۔

وحی جلی کہتی ہے کہ خدا کی کتاب بالکل محفوظ ہے لیکن احادیث کہتی

Marfat.com

ہیں کہ ایسی آیات (مثلاً آیتِ رجم) بھی ہیں جو پہلے قرآن میں ہوا کرتی تھیں لیکن بعد میں اس میں نہ رہیں۔

اِن چند مثالوں سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ وحی جلی اور وحی خفی کا باہمی تعلق کیا ہے یعنی خدا پہلے ایک حکم دیدیتا ہے کہ اسے قرآن میں درج کر لو اور اس کے بعد اس کے خلاف حکم دیدیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے قرآن میں درج نہ کرنا، الگ رکھنا لیکن عمل اسی پر کرنا۔

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہمارا کلیجہ کانپ رہا ہے کہ اس قسم کے دِین کے متعلق دنیا کیا اندازہ لگاتی ہوگی۔ مودودی صاحب اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ ذرا غور سے سُنیئے۔ دریافت کیا گیا کہ اگر رسول اللہؐ کی متعین فرمودہ جزئیات، عینِ دین ہیں اور قیامت تک کے لئے غیر متبدّل تو یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں (مثلاً) نماز کی جزئیات میں فرق ہے اور یہ فرق خود روایات کی رُو سے ہے، تو آج اس امر کا پتہ کس طرح لگایا جائے کہ ان میں سے کونسی چیز رسول اللہؐ کی متعین فرمودہ ہے۔ اس کے جواب میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ،

> یہ اختلاف اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضورؐ کا عمل مختلف دیکھا۔ چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور ان میں سے کسی کے کرنے یا کسی کے

Marfat.com

نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور حضورؐ خود صاحب شریعت تھے اس لئے آپ جس وقت جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے۔ لیکن حضورؐ کے سوا کوئی اور شخص چونکہ صاحب شریعت نہ تھا اور اس کا کام اتباع تھا نہ کہ تشریع۔ اس لئے ہر دیکھنے والے نے آپ کو جیسا فعل کرتے دیکھا اس کی پیروی کی اور اسی کی پیروی کے لئے لوگوں سے کہا۔" (صلا۳۳)

مودودی صاحب پہلے فرما چکے ہیں کہ

(۱) آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔ (ص۲۴۳)

(۲) رسولؐ کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ (ص۲۴۲)

(۳) آپؐ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ (ص۲۴۱)

اس کے بعد مودودی صاحب کے اقتباس بالا کو ملاحظہ فرمائیے جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

(۱) رسول اللہؐ کا مختلف اوقات میں مختلف عمل ہوتا تھا۔

(۲) اس قسم کے اختلافی امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

(۳) اس لئے جس نے جس طرح دیکھا اسی طرح پیروی کرنے لگ گیا۔

اگر رسول اللہؐ کا ہر فعل وحی کی رو سے اور رسول کی حیثیت سے ہوتا تھا تو اس سے لازم آیا کہ ایک وقت میں وحی کی رُو سے جزئیات کسی طرح

Marfat.com

متعین ہوا کہ تھیں اور دوسرے وقت میں کسی اور طرح۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ "آپ صاحب شریعت تھے، جس وقت جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے"۔ اگر "حضورؐ جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے" تو پھر ان اعمال میں وحی کا کیا دخل ہوتا تھا؟ پھر مودودی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ اختلافی امور نماز میں خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ یعنی یہ تمام امور منجانب اللہ ہوتے تھے اور حضورؐ بہ حیثیتِ رسول ان امور کو ادا فرماتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ یہ امور نماز میں خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے! سوچئے کہ یہ کس قسم کا دین ہے؟

اس کے بعد یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ مودودی صاحب کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ نماز میں فلاں فلاں بات تو اہمیت رکھتی ہے اور فلاں فلاں بات خاص اہمیت نہیں رکھتی!

اسے کہتے ہیں تلاعب بالدین۔ یعنی دین کے ساتھ کھیلنا۔

اب اسی ضمن میں ایک اور بات دیکھئے اور سوچئے کہ اسے کیا کہا جائے۔

حدیث شرح نہیں مستقل دین ہے

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن اصول کی کتاب ہے اور احادیث ان اصولوں کی تشریح اور تفصیل ہیں۔ اس کے مقابل میں

Marfat.com

مودودی صاحب کے اس دعوے کو سامنے لائیے جس سے اس بحث کا آغاز ہوا ہے یعنی ان کا یہ ارشاد کہ:۔

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت سے صرف شارح اور مفسر کی ہے۔ یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً ذکر قرآن میں آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے۔۔۔۔ مسائل واحکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۰ء)

یعنی ایک جگہ کہتے ہیں کہ قرآن کتابِ اصول ہے اور ان اصولوں کی شرح و تفسیر احادیث ہیں لیکن دوسری جگہ کہتے ہیں کہ نہیں! احادیث کی حیثیت شرح و تفسیر کی نہیں۔ مسائل و احکام میں ان کی حیثیت ایک مستقل ماخذ کی ہے۔ کیا دین کے ایسے اہم بنیادی معاملہ میں ایسے متضاد تصورات کہیں اور بھی دیکھنے میں آتے ہیں؟ کتنی بڑی جرأت ہے ان لوگوں کی؟

اب آگے بڑھتے۔ وحی کی ان دو قسموں کے تذکرہ کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

حفاظت حدیث جب یہ دونوں چیزیں رسول اللہ کے اتباع اور آپ کے نمونہ حیات کی تقلید کے ساتھ وابستہ ہیں تو لازم ہوا کہ سیرت نبویؐ

Marfat.com

کے وہ پاک نمونے اور زبان وحی ترجمان کے وہ مقدس احکام بھی قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہیں جن سے رسول اللہؐ کے ہم عہد لوگوں نے ہدایت پائی تھی ورنہ بعد کی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جائے گی۔ (ص ۲۹۴)

اس سے ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں:

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہؐ کا رہنا قطعاً ناگزیر اور ضروری ہے۔ (ص ۲۹۶)

چنانچہ اس کے لئے

جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے اس نے اپنے آخری نبیؐ کے نقوش قدم اور آثار ہدایت کی حفاظت کے لئے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے (ص ۳۱)

یعنی:-

(i) کتاب اللہ کے ساتھ احادیث کا رہنا قطعاً ناگزیر ہے۔

(ii) اگر احادیث ساتھ نہ رہیں تو بعد کی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جاتی ہے۔

(iii) اس لئے اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اسی طرح احادیث رسول اللہؐ کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے! اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ قرآن اور احادیث، دونوں اسی کی کتاب کی [illegible] اسی کی [illegible] اسی کے دین کے

Marfat.com

گوشے تھے۔ وہ ایسا کس طرح سے کر سکتا تھا کہ ان میں سے ایک حصے کی حفاظت کا تو انتظام کر دیتا اور دوسرے حصے کو ایسے ہی چھوڑ دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عدیم النظیر انتظام کس طرح سے فرمایا، اس کی تفصیل مودودی صاحب نے خود ہی بیان فرما دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

(اس زمانہ میں) ضبط اور نقل کا ذریعہ جو کچھ بھی تھا وہ لوگوں کا حافظہ اور زبانیں تھیں۔ قدیم زمانہ میں نہ صرف عرب بلکہ تمام قوموں کے پاس واقعات کو محفوظ رکھنے کا اور بعد کی نسلوں تک پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ تھا[1]۔ مگر عرب خصوصیت کے ساتھ اپنے حافظہ اور صحت نقل میں ممتاز تھے۔ (ص ۲۹۷)

اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک قرآن کی حفاظت کا انتظام بھی صرف حافظہ کی رو سے کیا گیا تھا۔ قرآن کہیں لکھا ہوا موجود نہ تھا۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں ضبط و نقل کا ذریعہ ہی حافظہ تھا دوسرا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا بہت اچھا اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام یہ کیا کہ انہیں لوگوں کے حافظہ میں محفوظ کرا دیا۔ اب آگے بڑھتے فرماتے ہیں

غلط احادیث

صداقت کے ساتھ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی داخل ہونے لگا تھا جو موضوع تھیں اور یہ کہ بعد کی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی ملی جلی تھیں۔ (ص ۱۰۱)

---

[1] لیکن قرآن کریم ... لوگوں کے ... میں محفوظ نہیں تھا کتاب کی صورت میں لکھا ہوا بھی موجود تھا اور گھر گھر اس کی تلاوت ہوتی تھی۔

Marfat.com

یہ ہوا نتیجہ اس عدیم النظیر انتظام کا جو اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کے لئے اختیار فرمایا تھا! خدائی انتظام بالآخر خدائی انتظام ہی ہوتے ہیں!! اللہ تعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام اس لئے فرمایا تھا کہ

اگر احادیث محفوظ نہ رہیں تو آنے والی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جائے گی۔

اور ہوا یہ کہ

پہلی ہی صدی کے بعد آنے والی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں، ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی حدیثیں ملی جلی تھیں۔

دیکھا آپ نے کہ اللہ نے اپنی ہدایت کو قیامت تک کے انسانوں کے لئے کس طرح محفوظ رکھا! اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

(۱) یہ بالکل صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں ہیں جس حد تک قرآن مجید ہے۔ اور

(۱۱) یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے (ص ۳۲۹-۲۸)

یہ وہی احادیث ہیں جن کے متعلق ابھی ابھی ارشاد ہوا تھا کہ

رسول اللہ نے جو کچھ استاد کی حیثیت سے بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں ہے۔

(ص ۳۲۶)

Marfat.com

اور اللہ نے جن کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا تھا" جو اپنی نظیر آپ تھا"

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے انھوں نے احادیث کو حفظ کر لیا اور یہی حفظ کردہ احادیث آگے منتقل ہوتیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے ارشادات بلفظہٖ حفظ کر لئے جاتے تھے اور وہی الفاظ آگے منتقل ہوتے چلے جاتے تھے۔ یا رسول اللہؐ جو کچھ کرتے تھے وہ سب کچھ اسی طرح نقل ہوتا چلا جاتا تھا۔ لیکن ذرا آگے چل کر وہ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ احادیث کے اختلاف کی وجہ کچھ اور تھی۔ لکھتے ہیں:

> بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہئے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو، اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرِ مو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اُس تقریر کے اہم اجزا میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے ہی پیش نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں

Marfat.com

اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجیے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا، کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح نہ ادا کرسکیگا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دیگا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی اور وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔ (ص ۳۲۹-۳۳۰)

یہ دوسری مثال ہے اس عظیم النظیر انتظام کی جو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے اس حصہ کو محفوظ رکھنے کے لئے اختیار فرمایا۔

بہرحال مودودی صاحب کو تسلیم ہے کہ احادیث کے جو مجموعے مرتب ہوتے ان میں (اللہ تعالیٰ کی تمام کوششوں کے باوجود) موضوع اور مشکوک احادیث بھی شامل ہوگئیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے انتظام کی تیسری کڑی سامنے آتی ہے یعنی ائمہ جرح و تعدیل نے ان احادیث کو پرکھا اور معتبر اور غیر معتبر احادیث کو الگ الگ کر دیا۔ نقد احادیث کے اس کارنامہ کو اسلام کی

Marfat.com

تاریخ میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور انہی ائمہ جرح و تعدیل کے فیصلوں کے مطابق احادیث کو قوی اور ضعیف تسلیم کیا جاتا ہے لیکن سنئے کہ مودودی صاحب انتظامِ خداوندی کے اس شعبہ کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے :—

جرح و تعدیل

دوسرے گروہ کو لیجئے جو دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں...... محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلم کہ نقدِ حدیث کے لئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں، ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا

Marfat.com

کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ (ص ۳۱۸)

پھر تحریر فرماتے ہیں:

محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے، مگر ان میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ (ص ۳۱۹)

غلطیاں بھی محض سہو و خطا کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر کہ

نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جاتے۔ یہ امکان محض امکان عقلی نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے۔ (ص ۳۱۹)

اس کے بعد انھوں نے مثالیں دی ہیں جن سے ثابت کیا گیا ہے کہ رواۃ احادیث کو ثقہ اور غیر ثقہ قرار دینے میں ائمہ جرح و تعدیل کا ذاتی رجحان کیا کچھ کرتا تھا۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

• اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوتی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہے۔ (ص ۳۲۱)

Marfat.com

پھر فرماتے ہیں:

ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے۔ مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو الخ .... یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبوی اور آثارِ صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (ص ۳۲۲)

جو کچھ مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس کے پیشِ نظر لامحالہ انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم یقینی طور پر کہہ سکیں کہ کونسی بات فی الواقعہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اور کونسی بات ایسی ہے جس میں کچھ اور بھی شامل ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انسان اس منطقی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ

(۱) احادیث کی حفاظت کا انتظام اللہ نے نہیں کیا کیونکہ خدا کا انتظام ایسا ناقص نہیں ہو سکتا۔ اس نے قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اور دیکھئے کیسا مکمل انتظام کیا!

(۲) لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ احادیث کا محفوظ رکھا جانا

Marfat.com

منشاء خداوندی نہ تھا۔ کیونکہ اگر خدا کا یہ منشا ہوتا تو کس کی مجال تھی کہ ان میں ذرا بھی ردوبدل یا تحریف والحاق کر سکتا۔

(iii) چونکہ خدا نے احادیث کو محفوظ رکھنے کا انتظام نہیں کیا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دین کا حصہ نہ تھیں۔ دین قیامت تک غیر متبدل رہنے والی شے ہے اور غیر متبدل شے ہمیشہ محفوظ رکھی جاتی ہے۔

(iv) لہٰذا احادیث کی وقتی حیثیت جو بھی ہو، یہ منشاء خداوندی نہیں تھا کہ یہ ابدی طور پر واجب الاتباع رہیں۔ اگر انھیں واجب الاتباع رہنا تھا تو ان کا محفوظ رکھا جانا بھی ضروری تھا۔

لیکن مودودی صاحب اس نقص انتظام کا اقرار کرنے کے باوجود مُصر ہیں کہ احادیث قیامت تک کے لئے واجب الاتباع ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر خدا کا انتظام اس باب میں ناکام رہا ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہے کہ ہم انھیں دین ہی تسلیم نہ کریں، یہ دین ہیں اور دین ہی رہیں گی۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ غلط اور صحیح کے اس ذخیرے سے یہ معلوم کس طرح کیا جائے کہ کونسی احادیث صحیح ہیں اور کونسی غلط! دیکھئے اس کے جواب میں کیا ارشاد ہوتا ہے:

مزاج شناس

مگر جس طرح شاہدوں کے بیانات کا جانچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اسی طرح

Marfat.com

درایت بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حدیث کو اصولِ درایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصولِ اولیہ کو خوب سمجھ لیا ہو، اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اوّل نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہؐ ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں؟ یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟ (ص ۳۰۲)

اس کی تشریح میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر

Marfat.com

جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبویؐ کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسول اللہؐ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اسکا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک خبر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے

Marfat.com

بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معلّٰے بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (صفحہ ۲۲۳-۲۲۴)

غور فرمایا آپ نے کہ مودودی صاحب کس مقام سے بول رہے ہیں! جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) رسول اللہ کی احادیث، خدا کی طرف سے وحی ہیں۔ وہ قیامت تک غیر متبدل ہیں۔ ان کی اتباع، خدا کے حکم کی تعمیل اور نبی اکرم کی اطاعت ہے۔

(۲) ان احادیث کا کوئی مستند مجموعہ نہ خدا نے مرتب کر کے دیا نہ اس کے رسول نے۔

(۳) محدثین نے ان مجموعوں کو مرتب کیا ہے لیکن ان کے فیصلے قابلِ سند نہیں ہیں۔

(۴) یہ وہی شخص بتا سکتا ہے کہ جو رسول کا مزاج شناس ہو کہ رسول اللہ نے کیا فرمایا تھا۔

(۵) نہ صرف یہ کہ ان مجموعوں میں ارشاداتِ رسول اللہ کون سے ہیں بلکہ اگر کوئی نیا معاملہ پیش آجاتے تو یہ بھی کہا سکتا ہے کہ اس باب میں رسول اللہ کیا حکم دیتے

(۶) لہٰذا خدا کا دین، اسکی عبدیت، رسول اللہ کی اتباع، اس شخص کے فیصلوں کی اطاعت کا نام ہوا یہ ہو وہ نظامِ اطاعت جو اللہ نے اپنے آخری دین کی حیثیت سے قیامت تک کیلئے فاقد العمل رہنے کیلئے عطا فرمایا تھا۔

"مزاج شناس" کے اختیارات!

اب اس "مزاج شناس ذات رسالتمآب"

Marfat.com

کے اختیارات ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں:

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ کے اتباع کا حکم دینے سے یہ مراد نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا، لوگ بھی بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں اور اپنی زندگی میں آپ کی حیاتِ طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کرکے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے طرزِ عمل سے مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق دیا ہے

اور ہم آپ کے طریقہ کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روح اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہتا ہے اور اسی غرض سے آپ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہئے اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہئیں اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہئیں۔ (ص۲۷۵)

یہ وہی مودودی صاحب ہیں جو ابھی ابھی فرما چکے تھے کہ

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے، مربی اور مزکی بھی تھے۔ قاضی اور حاکم بھی تھے۔ امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے۔ (ص۲۴۱)

یعنی پہلے یہ ارشاد ہوا تھا اور اس کے بعد یہ کہ "تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کی جزئیات" میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں حضورؐ کی اتباع طابق النعل بالنعل ہوگی اور بعض ایسی جن میں رخصت ہوگی۔

Marfat.com

اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ کون سے امور ہیں جن میں حضورؐ کی اطاعت قدم بقدم کی جائے گی اور کون سے ایسے جن میں آزادی ہوگی ؟" وہی مزاج شناس ذاتِ رسالتمآبؐ" : اور کون ؟

اسی ضمن میں آگے چل کر فرماتے ہیں :

اب رہ گئے احکام، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں، مثلاً عہد نبویؐ کے قوانین مدنی، اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں، دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیے۔ (صفحہ ۳۳۲)

Marfat.com

اس بات کا فیصلہ بھی وہی "مزاج شناس" کرسکیگا کہ وہ کونسی تفاصیل ہیں جن میں ہم اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں اور وہ کونسی جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یعنی:

(i) قرآن کتاب اصول ہے اس لئے اس سے عملی جزئیات میں ہدایت نہیں مل سکتی۔

(ii) عملی جزئیات احادیث ہیں جن کی اطاعت فرض ہے۔

(iii) احادیث صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ جو صحیح ہیں ان میں بھی بعض ایسی ہیں جو واجب الاتباع ہیں اور بعض ایسی جن کی اتباع ضروری نہیں ہے اور جن کی اتباع ضروری نہیں۔ ان میں بعض ایسی ہیں جن میں اجتہاد سے استنباط کیا جاسکتا ہے اور بعض ایسی جن میں اجتہاد کی گنجائش نہیں

(iv) یہ فیصلہ صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو "مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآبؐ" ہو کہ کونسی احادیث صحیح ہیں اور ان میں سے بھی کونسی من وعن واجب الاتباع۔

(v) لہٰذا ظاہر ہے کہ اب اُمتِ مسلمہ کے لئے ہدایتِ خداوندی کا مدار اس "مزاج شناسِ ذاتِ رسالتمآبؐ" کا فیصلہ رہ گیا۔ اسے نہ کسی سند کے پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ دلیل کی۔ یہ خالص "ذوق" کی چیز ہے جس میں کوئی دوسرا شریک ہی نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ موجود ہے انہیں سے بھی وہی دین ہوگا جسے یہ شخص دین کہہ دے گا اور جو موجود نہیں ہے اس کے متعلق بھی یہی بتلائے گا کہ اگر رسول اللہؐ موجود ہوتے تو آپؐ کیا فیصلہ دیتے۔ لہٰذا اس

Marfat.com

"مزاج شناس" کے فیصلے رسول اللہؐ کے فیصلے ہوں گے اور چونکہ رسول اللہؐ کے فیصلے خدا کی وحی ہوتے تھے اس لئے اس کے فیصلے بھی وہی حیثیت رکھیں گے۔ اب اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہوگی اور اس کی معصیت خدا اور رسول کی معصیت، لہٰذا اب دنیا کو اپنی نجات وسعادت کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے!

خلاصۂ مبحث

چونکہ یہ موضوع بہت اہم ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں اس کا ملخص پیش کر دیا جائے تاکہ بات اچھی طرح سے ذہن میں مرتسم ہو جائے۔

آغازِ سخن مودودی صاحب کے اس دعوے سے ہوا تھا کہ

(ا) احادیث کی حیثیت، محض قرآن کی تشریح اور تفسیر کی حیثیت نہیں بلکہ مسائل واحکام میں احادیث، دین کا مستقل ماخذ ہیں۔ اس لئے کہ:

(ب) خدا کی طرف سے دو چیزیں وحی کے ذریعے ملی تھیں ایک کتاب اللہ دوسرے احادیث رسول اللہؐ۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) رسول اللہؐ زندگی کے ہر سانس میں رسول تھے۔ آپ کی ہر بات ہر حال اور ہر آن میں وحی کی رو سے ہوتی تھی۔

(۲) رسول اللہ اپنے اجتہادات میں غلطی کر جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ

Marfat.com

فوراً اصلاح کر دیتا تھا۔

(۳) رسول اللہؐ کے اجتہادات، آپ کی خداداد بصیرت کی بنا پر ہوتے تھے۔

(۴) احادیث اقوالِ رسول اللہؐ ہیں۔

(۵) احادیث، اقوالِ رسول اللہؐ نہیں بلکہ قرآن کی طرح وحی ہیں۔ اسی طرح اجتہاداتِ نبویؐ بھی منزل من اللہ تھے۔ اسے وحی خفی کہا جاتا ہے۔

(۶) وحی خفی کے ذریعے جو کچھ ملتا تھا وہ رسول اللہؐ کی اپنی ہدایت کے لئے تھا۔ عام ہدایت نامہ اور دستور العمل قرآن ہی تھا۔

(۷) قرآن کتاب اصول ہے۔ احادیث اس کی شرح اور تفسیر ہیں۔

(۸) یہ شرح و تفسیر اس لئے قرآن میں درج نہیں کی گئی کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جاتی۔

(۹) چونکہ قرآن اور احادیث دونوں وحی تھے اس لئے اللہ نے جس طرح قرآن کی حفاظت کا انتظام کیا اسی طرح احادیث کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا۔

(۱۰) عربوں میں نقل و ضبط کا ذریعہ صرف حافظہ تھا اس لئے وحی کی حفاظت حافظہ کی رو سے ہوئی۔

(۱۱) انتظام خداوندی کے باوجود پہلی صدی کے بعد ہی احادیث کے مجموعوں میں موضوع اور مشکوک احادیث داخل ہونا شروع ہوگئیں۔

(۱۲) ائمہ جرح و تعدیل نے احادیث اور ان کے رواۃ کے پرکھنے

Marfat.com

کا بڑا اہم کام کیا. لیکن وہ بھی انسان ہی تھے. اس لئے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ جسے انھوں نے صحیح کہہ دیا وہ صحیح ہے اور جسے غلط کہہ دیا وہ غلط۔

(۱۳) اب غلط اور صحیح کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے جو مزاج شناسِ ذات رسالتمآبؐ ہو. یہ بھی وہی بتا سکتا ہے کہ صحیح حدیثوں میں بھی کون کونسی احادیث واجب الاتباع ہیں. اور یہ بھی کہ کس کس بات میں اجتہاد کی اجازت ہے اور کس میں نہیں۔

یہ ہیں دلائل اس دعوے کے اثبات کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن ہی نہیں ملا بلکہ قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ (مثلہ معہ) دوسری چیز بھی ملی جسے مجموعۂ احادیث کہا جاتا ہے ہم اس باب میں کسی مزید تبصرہ یا تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے. مودودی صاحب کی تحریروں کے اقتباسات آپ کے سامنے ہیں. اگر آپ اصل عبارات دیکھنا چاہیں تو ان کی تصنیف "تفہیمات حصّہ اول" لے لیجئے اور اس کے بعد از خود کسی نتیجہ پر پہنچ جایئے۔

جہاں تک مودودی صاحب کے اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ کا تعلق ہے انھیں وہ یہ کہہ کر مطمئن کرا سکتے ہیں کہ طلوع اسلام آج سے نہیں، شروع سے اسلامی جماعت کا مخالف چلا آرہا ہے انہیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس نے کیا لکھا ہے۔ جماعت عقیدتمندی وہ قلعہ ہوتی ہے جس کے اندر انسان کو اپنی مدافعت کے لئے کچھ کہنے یا کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جہاں کسی نے

Marfat.com

کچھ کہا فوراً کہدیا کہ یہ لوگ ہماری جماعت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے جماعتی حمیت جوش میں آجاتی ہے اور کسی کو اتنا سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی کہ کہنے والے کی بات کو سن لیا جائے اور اس پر غیر جانبدارانہ انداز سے غور کر لیا جائے۔ لیکن جو لوگ اس جماعتی عصبیت سے باہر ہیں ہم ان سے عرض کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے اسے نہایت غور سے دیکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ دینِ خداوندی فی الواقعہ وہی ہے جسے مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں! اور کیا ایسے دین میں انسان خدا کی اطاعت کرتا ہے یا پیشوائیت Priesthood کی آمرانہ قوتوں کی!! اسی سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آجائے گی کہ یہ لوگ اس پر کیوں مصر ہیں کہ دینِ خداوندی یہی ہے۔ آپ مودودی صاحب کے پیش کردہ دلائل پر غور کیجئے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان کی تحریروں میں کس قدر تضاد ہے۔ اب صورتِ حالات یہ ہے کہ اگر مودودی صاحب اس قسم کے کمزور دلائل اور متضاد بیانات کے باوجود، اپنے مسلک کو فی الواقعہ حق وصداقت کا مسلک سمجھتے ہیں تو آپ کی علمی بصیرت کے متعلق جو رائے قائم کی جا سکتی ہے وہ ظاہر ہے اور اگر وہ اپنے مسلک کی کمزوری کو محسوس کرنے کے باوجود اس پر قائم ہیں تو اسے مصلحت کوشی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نیتوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا ہے اس لئے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن

Marfat.com

ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی شکل ہو، یہ تو واضح ہے کہ مودودی صاحب کا پیش کردہ مسلک، اس دین کا مسلک نہیں ہے جو اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی اکرمؐ کی وساطت سے بھیجا تھا۔

مودودی صاحب کے تضادات

احادیث کو دین قرار دینے میں مودودی صاحب کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ رسول ہر حال اور ہر آن میں رسول ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی ہر بات منجانب اللہ ہوتی ہے۔ جو شخص رسول کی الگ الگ حیثیتیں قرار دیتا ہے وہ دین کے بنیادی اصول سے ناواقف ہے۔ چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے:

> لیکن یہ تفریق جو انہوں نے (علامہ اسلم جیراجپوری نے) محمدؐ ابن عبداللہ بہ حیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بہ حیثیت مبلّغ ہونے کے درمیان کی۔ قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرت کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول اور نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل، ہر قول، رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ حتیٰ کہ آپؐ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ قرآن کریم میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بناء پر آنحضرتؐ کی حیثیت رسالت اور

Marfat.com

حیثیتِ انسان اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔
(تفہیمات حصہ اوّل ۲۴۴)

آپ اس دعوے کو غور سے دیکھ لیجئے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مودودی صاحب کے نزدیک رسول کی ایک ہی حیثیت ہے اور قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت کی حیثیتِ رسالت اور ذاتی حیثیت میں فرق کیا گیا ہو۔ اس کے بعد آپ انہی مودودی صاحب کا یہ بیان ملاحظہ فرمایئے، ارشاد ہے:

اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے یہ کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص، مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبد اللہ ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو...... اسی لئے اللہ تعالیٰ بار بار اپنے نبی سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے دراصل نبی بہ حیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بہ حیثیت نبی کی اطاعت ہی یعنی اس علم اس ہدایت، اس حکم اور اس قانون کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۶ء)

Marfat.com

غور فرمایا آپ نے! ایک جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ "قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بناء پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسان میں کوئی فرق کیا گیا ہو"۔ اور دوسری جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ "قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے ...... اور اللہ تعالیٰ بار بار اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ "نبی کی حیثیتِ رسالت الگ ہے اور ذاتی حیثیت الگ!

مودودی صاحب اپنی کتاب "رسائل ومسائل" میں فرماتے ہیں:

"جو امور آپؐ (رسول اللہ) نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کرلیں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے"۔ (صفحہ ۳۰)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبیؐ نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور

Marfat.com

ہیں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ (ص۳۱۰-۳۱۱)

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرز خاص کا لباس نبی پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جس سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔" (ص۳۱۴)

یہ وہی مودودی صاحب ہیں جو ابھی یہ فرما رہے تھے کہ:

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک

Marfat.com

آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل، ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ "رسول کی حیثیت" کے سے اہم اور بنیادی مسئلہ میں اس قدر کھلا ہوا تضاد کیوں؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب مودودی صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ رسول کی ایک ہی حیثیت ہوتی ہے۔ اس کی حیثیتِ رسالت اور ذاتی حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا، تو اُس وقت مقصد صرف یہ تھا کہ فریقِ مخالف کو منکرِ حدیث اور اپنے آپ کو حامیٔ سنّت ثابت کیا جائے چنانچہ اُس وقت یہ فرمادیا کہ "قرآن میں خفیف سے خفیف اشارہ بھی نہیں ملتا کہ رسول کی دو حیثیتیں تھیں"۔ اس کے بعد جب خود مودودی صاحب کے خلاف اعتراض کیا گیا کہ اُن کی ڈاڑھی اتنی لمبی نہیں ہے جتنی مقدار احادیث میں آتی ہے، تو آپ نے فرمادیا کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ رسول کی دو حیثیتیں ہیں، ایک رسالت کی حیثیت اور ایک ذاتی حیثیت، ڈاڑھی کا مسئلہ حضورؐ کی ذاتی حیثیت سے متعلق ہے اس لئے اسے سُنّت نہیں کہا جا سکتا۔ اسے سنت کہنے والا دین میں تحریف کرتا ہے!

جب یہ پوچھا گیا کہ اسے کون بتائے گا کہ رسول اللہ کی کونسی بات بہ حیثیتِ رسول تھی اور کونسی بہ حیثیتِ انسان، تو فرمایا کہ اسے وہی بتا سکیگا

Marfat.com

جو اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو"

غور فرمائیے کہ دین کے اہم اصول کس طرح سے متعین ہو رہے ہیں؟

کیا اس طرح سے دین، بچوں کا کھیل نہیں بن جاتا؟

اسی بحث کے اخیر میں مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ:

> اگر (ڈاڑھی کی) کوئی مقدار بھی ضروری ہوتی اور اس مقدار کا قائم کرنا بھی حضور کے مشن کا کوئی جزو ہوتا تو آپ ہرگز اس کے تعین میں کوتاہی نہ کرتے۔ مجمل حکم کے دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملہ میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے۔ (صفحہ ۲۱۵)

بعینہٖ یہی بات ہم اللہ تعالیٰ کے متعلق کہتے ہیں کہ (مثلاً) اگر زکوٰۃ کی کوئی مقدار مقرر کرنا دین کا جزو ہوتا، اور اس مقدار کو غیر متبدل رکھنا منشائے خداوندی ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہرگز اس کے تعین میں کوتاہی نہ کرتے۔ مجمل حکم کے دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملے میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق مقدار کا تعین خود کریں۔

یہی اصول اس اہم مسئلہ میں قولِ فیصل ہے۔

مزاج شناسی

اب رہا "مزاج شناسی" کا سوال، سو اس کے لئے ذیل کا شذرہ ملاحظہ فرمائیے جو "نبوتِ جدیدہ" کے

Marfat.com

عنوان سے طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔

دین میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں حجت سند کو حاصل ہے۔ حجت کے معنی ہیں ایسی دلیل جس سے آپ انکار نہ کر سکیں اور سند سے مراد ہے قرآن کریم یعنی جب آپ یہ کہیں کہ فلاں معاملہ میں دین کا حکم یہ ہے تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ اس حکم کے لئے آپ کے پاس قرآن کی کونسی سند ہے۔ ایسی کسی سند کے بغیر کسی کا کوئی قول دین میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

قرآن سے نیچے اترے تو بعض لوگوں نے حدیث کو بھی اسی قسم کی سند تصور کر لیا چنانچہ ان لوگوں کا مسلک یہ قرار پایا کہ جب کوئی یہ کہے کہ اسلام میں فلاں معاملہ کے متعلق یہ حکم ہے تو اس سے قرآن کے بعد یہ بھی پوچھا جا سکے گا کہ اس کی سند میں تمہارے پاس کونسی حدیث ہے۔

اور آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے قرآن (یا قرآن وحدیث) کے اصولی احکام سے جزئی احکامات مستنبط کئے اور اس استنباط میں اپنے قیاس سے کام لیا اسے فقہ کہتے ہیں لیکن جب اہلِ فقہ سے بھی پوچھا جائے تو انھیں بھی یہ بتانا ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی مسئلہ کے متعلق اس حکم کو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث پر قیاس کر کے مستنبط کیا ہے۔ یعنی سند سے یہ گروہ بھی بے نیاز نہیں۔

اس سے آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے ان فقہا کے فیصلوں کو دین

Marfat.com

ہیں سند تسلیم کر لیا چنانچہ جب ان سے پوچھا جائے کہ تم کس طرح کہتے ہو کہ فلاں بات میں اسلام کا فیصلہ یہ ہے تو وہ اپنے قول کی تائید میں کسی نہ کسی امام کا فیصلہ بطور سند کے پیش کریں گے۔ لیکن اس نقطۂ خیال کا بھی اگر تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کارفرما نظر آئے گا کہ ہمارا امام یا ہمارا مجتہد اپنی طرف سے خود کچھ نہیں کہتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے وہ قرآن و حدیث کو سامنے رکھ کر کہتا ہے۔ چنانچہ آپ ہر فقیہ سے یہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے امام کے اس فیصلہ کی کیا سند ہے جس پر وہ فقیہ آپ کو قرآن یا حدیث سے اپنے امام کے اس فیصلہ کی سند پیش کر دے گا۔ چنانچہ فقہ کی کتابیں ان دلائل سے بھری پڑی ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے معاملہ میں چودہ سو سال سے آج تک سند ضروری رہی ہے۔ آپ کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے کہ دین میں فلاں چیز (حدیث، یا قیاس، یا کسی امام کا قول) سند ہو سکتا ہے یا نہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دین میں سند کا ہونا لاینفک ہے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے سے یہ کہے کہ دین کا یہ حکم یوں اس لئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔

یہ ہے وہ اصل عظیم جس پر دین کی بنیاد قائم ہے۔ یعنی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا قول بطور دینی حکم کے

Marfat.com

منواتے اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر دوسرے شخص سے یہ پوچھ لے کہ جس بات کو تم دین کا حکم کہتے ہو اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے؟

حتیٰ کہ ایک نبی اور رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی سے یوں کہہ سکے کہ دین کا یہ حکم یوں اس لئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔ اس کو بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ دین کا یہ حکم اس لئے ہے کہ خدا کا ایسا ہی حکم ہے۔

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتٰب والحکم والنبوۃ

ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولٰکن

کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتٰب وبما کنتم

تدرسون۔ (۳/۷۸)

(کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسان کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے، خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیے کہ ربانی انسان (یعنی خلق اللہ کے مرشد و مربی) بنو، اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو اور اس لئے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو)

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے ہر حکم کے لئے رسول کو بھی خدا کی طرف اپنی سند

Marfat.com

بیان کرنی پڑتی ہے یعنی اسے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ خدا کا یہ حکم ہے اس لئے میں ایسا کہہ رہا ہوں۔

البتہ نبی کا صرف ایک دعویٰ ایسا ہوتا ہے جہاں سند یا دلیل طلب نہیں کی جاسکتی اور یہ اس کا دعوائے نبوّت ہوتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ کہ خدا نے اسے ایک ایسی چیز عطا کی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اس دعوے کے لئے دراصل رسول کا اپنا دعویٰ ہی سند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں رسول پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جب رسول یہ کہے کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو کہ خدا نے واقعی یہ حکم دیا ہے یعنی رسول کا وہ حکم اُسے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے۔

بہرحال دین میں ایک مقامِ نبوت ہی ایسا مقام ہے جہاں سند کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ نکتہ یاد رہے کہ سند کا یہ مطالبہ صرف اس امر میں نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حکم اس کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے۔ اور بس۔

یہاں سے آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اگر کوئی شخص آج اِس قسم کا ادعا کرتا ہے کہ اس کا علم دین میں اس لئے واجب التعمیل ہے کہ وہ ایسا کہتا ہے تو دراصل وہ اپنے لئے مقامِ نبوت کا دعویدار ہے بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر کیونکہ اس ادعا کا حق تو ایک نبی کو بھی حاصل نہیں ہے بلکہ اسے

Marfat.com

بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے اس لئے میں ایسا کہتا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ بابِ نبوّت بند ہو گیا اس لئے اب رسول اللہ کے بعد کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ بلاسند کوئی بات دین کی حیثیت سے کسی سے منوا سکے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ کبریٰ ہے جس میں آج تک کسی کو اختلاف کرنے کی جُرأت نہیں ہوئی۔

البتہ صوفیہ میں سے بعض حضرات نے ضرور یہ کہا ہے کہ مجھے فلاں فلاں بات کشف یا الہام کے ذریعہ سے معلوم ہوتی ہے اور کشف یا الہام ایک ایسی چیز ہے جس کی تائید میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کیجا سکتی۔ مگر سب کو معلوم ہے کہ آج تک کشف و الہام کو دین میں کسی نے بھی حجت قرار نہیں دیا حتّٰی کہ خود صاحبِ کشف اپنے کشف کو خود اپنے لئے بھی دینی حجت نہیں مانتا۔

بہرحال تیرہ سو برس سے امت میں یہ مسلک متفقہ طور پر چلا آرہا تھا یعنی یہ مسلّمہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں اپنی بات کو بغیر سند کے منوا سکے یعنی وہ یہ کہے کہ جس بات کو میں صحیح کہدوں وہ صحیح ہے اور جس بات کو میں غلط کہوں وہ غلط ہے۔ تیرہ سو سال کے بعد اس مسلّمہ کو مرزا غلام احمد قادیانی نے توڑا۔ کس طرح توڑا؟ یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔ مرزا غلام احمد نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں قرآن اور حدیث

Marfat.com

کو نہیں مانتا بلکہ وہ اپنے ہر دعوے کے لئے کتاب و سُنّت اور قرآن و حدیث کے الفاظ دُہراتا رہتا تھا۔ اس کی تمام تصانیف ان الفاظ سے بھری پڑی ہیں لیکن اس نے ایک ایسا چور دروازہ کھول لیا جس کی رُو سے قرآن اور حدیث سند بننے کے بجائے خود مرزا صاحب کے فیصلوں کے تابع ہو جائے اس کے لئے صغریٰ اور کبریٰ کی ضرورت تھی۔ صغریٰ تو مُلّا کے مذہب نے گھڑا گھڑایا اس کے لئے پہلے سے تیار رکھ چھوڑا تھا یعنی وحی کی دو قسمیں ہیں ایک متلو اور دوسرے غیر متلو۔ دونوں ہم پایہ ہیں اور دین میں دونوں کی حیثیت ایک ہے۔ لیکن چونکہ وحی غیر متلو (حدیث) قرآن کی تشریح کرتی ہے اس لئے اگر ان دونوں میں کہیں اختلاف نظر آئے تو حدیث کو راجح تسلیم کرنا ہوگا اور ماننا پڑے گا کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔ اس طرح قرآن کو ایک طرف بالائے طاق رکھا جا چکا تھا اور دین کی اصلی سند حدیث قرار پا گئی تھی۔ اس کے بعد مرزا صاحب کو صرف کبریٰ اپنی طرف سے لگانا تھا۔ اس کبریٰ کے بھی دو جزو تھے۔ پہلا جزو یہ تھا حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ کبریٰ کے اس جزو میں بھی مُلّا کا مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا کیونکہ اس کے ہاں خود اس موضوع پر بے شمار ذخیرہ کتابوں میں مدون موجود تھا، فرق مختلفہ اور پھر مذاہب اربعہ کے اختلافات نے احادیث کی تصحیح و تغلیط کا پہلے ہی بازار گرم کر رکھا تھا۔

Marfat.com

سُنّیوں کے نزدیک شیعوں کی حدیثیں غلط اور موضوع تھیں اور شیعوں کے ہاں سُنّیوں کی۔ یہی حال جبریہ قدریہ معتزلہ جہمیہ فرقوں کے ساتھ تھا۔ پھر سنیوں میں بھی ایک حدیث حنفیوں کے ہاں صحیح تھی تو شافعیوں کے ہاں غلط تھی، دوسری حدیث مالکیوں کے ہاں صحیح تھی تو حنبلیوں کے ہاں ضعیف اور موضوع تھی۔ اس لئے مُلّا کا مذہب گیارہ سو سال سے جس اکھاڑے کو جمائے چلا آرہا تھا آج اس سے انکار کیسے کرسکتا تھا۔ مرزا صاحب کو کبریٰ کا صرف ایک آخری جزو وضع کرنا پڑا یعنی جب یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح حدیثیں کونسی ہیں اور غلط کونسی تو انھوں نے کہدیا کہ جس حدیث کو میں صحیح کہوں وہ حدیث صحیح ہے اور وہی دین میں سند ہے اور جسے میں غلط کہدوں وہ غلط ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن وحدیث پر کس طرح بجر بٹّو گھمایا گیا ہے اور اپنے فیصلوں کو دین کی سند بنا دیا گیا ہے جس کے لئے کسی دوسری سند کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی کا نام درحقیقت نبوت تھا مگر احتیاطاً اسے ظلّی نبوّت سے تعبیر کیا گیا اس فرق کے ساتھ کہ اصل کی حیثیت محض سائے کی رہ جاتے اور سایہ ہی اصل قرار پاجاتے۔ احادیث کا ذخیرہ ایک بے پناہ جنگل تھا جس میں سے ہر مسلک کے لئے چسپاں ہوجانے والی روایات چھانٹی جاسکتی تھیں چنانچہ مرزا صاحب نے ان ہی احادیث کی مدد سے اپنی ظلّی اور بروزی نبوّت کہیں مسیحیت موعودہ اور کہیں مجدّدیت و مہدویت کے

Marfat.com

مختلف ڈھونگ رچائے اور مُلّا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ وہ چلّایا بھی تو صرف یہ چلّایا کہ مرزا صاحب یہ حدیثیں تو موضوع ہیں۔ ضعیف ہیں۔ ان کے مقابلہ میں دوسری صحیح حدیثیں موجود ہیں جن سے ان تمام باتوں کی تردید ہوتی ہے مگر مرزا صاحب نے کمال حقارت کے ساتھ للکار کر اس کا منہ بند کر دیا کہ

جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔ (تحفۂ گولڑویہ صفا)

یعنی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کی سند خود مرزا صاحب کا وہ علم ہے جو انھوں نے خدا کی طرف سے پایا۔ لہٰذا ذخیرہ احادیث میں سے جو بقول قادیانیت۔

حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کی پٹاری کی ہے جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔ (الفضل قادیان بابت ۱۵؍جولائی ۱۹۳۴ء)

مرزا صاحب نے جو چاہا نکال لیا اور صحیح قرار دیدیا۔ کون تھا جو ان کی زبان پکڑ سکتا تھا۔ حدیث کے پردہ میں مرزا صاحب نے اپنا سکہ چلا دیا اور مجددیت، مہدویت اور ظلی اور بروزی نبوت منواتے چلے گئے۔ یہ تھیں وہ سیڑھیاں جن سے مرزا صاحب نبوت کے بامِ بلند تک پہنچ گئے۔

آج بعینہٖ انہی سیڑھیوں سے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی

Marfat.com

مشقِ نبوت فرما رہے ہیں۔ مودودی صاحب نے بھی پہلے یہی کہا کہ وحی دو قسم کی ہے۔ ایک کا مجموعہ قرآن ہے اور دوسری کا مجموعہ حدیث۔ پھر یہ کہا کہ حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ صحیح حدیثیں وہ ہیں جنہیں مزاج شناسِ نبوت صحیح کہدے اور غلط وہ جنہیں وہ غلط ٹھہرا دے۔ اس طرح کتاب وسنت اور قرآن وحدیث کی رٹ لگاتے ہوتے وہ اسی مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں قرآن اور حدیث خود ان کے فیصلوں کے تابع ہو جاتے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے اسلام کا مزاج عین نبوت کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنتِ

Marfat.com

رسول اللہ کا گہرا مطالعہ[1] کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنتِ نبویہ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی رُوح، رُوحِ محمدی میں گمؐ اور اس کی نظر بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد[2] ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوتی ہے وہ اسے

---

[1] مرزا صاحب کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں نے رسول اللہؐ کی ایسی اطاعت کی ہے کہ اس سے میرے اندر ایسا علم پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر میں اسناد سے بے نیاز ہو کر خود معیار بن گیا ہوں اور اسی کو ملکہ نبوت کہتے ہیں۔ ۱۲

[2] مرزا صاحب نے اسی کا نام ظلی اور بروزی نبوت رکھا ہے۔ ۱۲

Marfat.com

طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔"
(تفہیمات حصہ اول صفحہ ۳۲۳، ۳۲۴)

آپ مرزا صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس اور مودودی صاحب کی ان تصریحات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھئے اور سوچئے کہ مودودی صاحب کا یہ مسلک کسی طرح بھی مرزا صاحب کے اس مسلک سے مختلف ہے؟ "مزاج شناسیٔ نبوت" اور "بصیرت نبوی" ایسی چیزیں ہیں جن پر کوئی دلیل یا سند نہ پیش کی جاسکتی ہے نہ مانگی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے کسی ایک کا اتنا کہدینا ہی کافی ہے کہ میری مزاج شناسیٔ نبوت یا بصیرتِ نبوی کا یہی فیصلہ ہے اور اس کا یہ فیصلہ بیک جُنبشِ ابرو "دین" بن سکتا ہے "بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہی فیصلہ دل کا" یہ وہ مقام ہے جو صرف ایک نبی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے کہ وہی اپنی بات کو بحیثیت دین کے بغیر کسی سند و دلیل کے منوا سکتا ہے۔ چودہ سو سال سے اُمت میں آجتک کسی کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا۔ اُمت میں بڑے بڑے اولوالعزم خلیفہ، بادشاہ، امام، فقیہ، اولیاء اللہ ہو چکے ہیں مگر مرزا صاحب اور مودودی صاحب سے پہلے کسی نے اپنے لئے یہ پوزیشن حاصل کرنے کی جُرأت نہیں کی۔ ان دونوں میں فرق اتنا ہی ہے کہ اول الذکر اپنی اس پوزیشن کو ظلی اور بروزی نبوت سے تعبیر کرتا ہے اور ثانی الذکر مزاج شناسیٔ نبوت" یا "بصیرت نبوی" بلکہ "اپنی روح کو روح محمدی میں گم"

Marfat.com

ہو جانے اور "اپنی نظر کو بصیرت نبوی کے ساتھ متحد" ہو جانے سے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض تعبیرات کا فرق ہے۔ اس تعبیری فرق سے حقیقت نہیں بدلی جا سکتی۔ اس تفصیل کے بعد ہم ناظرین سے پوچھتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان دونوں مدعیوں میں کیا فرق ہے۔ کیا دونوں کا مطمح نظر اور منزل مقصود ایک ہی نہیں ہے؟

طلوع اسلام بار بار متنبہ کرتا رہا ہے اور اب پھر ملت کو متنبہ کرتا ہے کہ خدا کے لئے ان چور دروازوں کو بند کرو۔ دین کی بنیاد صحیح قرآن اور فقط قرآن ہے جو ابدالآباد تک کے لئے واجب العمل ہے۔ روایات اس عہدِ مبارک کی تاریخ ہیں کہ رسول اللہ صلعم والذین معہ نے اپنے عہد میں قرآنی اصول کو کس طرح متشکل فرمایا تھا۔ یہ اس عہد مبارک کی شریعت ہے۔ قرآنی اصول کی روشنی میں کسی فرد واحد کو جزئیات مستنبط کر کے اپنے عہد کے لئے شریعت بنا دینے کا حق نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اتباع محمدی (بقول مرزا) یا کتنا ہی مزاج شناسی رسول (بقول مودودی) کا دعویدار کیوں نہ ہو۔ بلکہ یہ حق صرف صحیح قرآنی خطوط پر قائم شدہ مرکز ملت اور اسکی مجلسِ شوریٰ کا ہے کہ وہ قرآنی اصول کی روشنی میں صرف ان جزئیات کو مرتب و مدوّن کر سکے جن کی قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی۔ پھر یہ جزئیات ہر زمانہ میں ضرورت پڑنے پر تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ یہی اپنے زمانے کے لئے شریعت ہیں۔

Marfat.com

مرزا صاحب کی نبوت نے جو فتنہ برپا کیا تھا اس وقت اس کے خلاف ملت کی طرف سے بڑی سختی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ جتنے عرصہ میں وہ اس پرانی نبوت کے فتنہ کا استیصال کرینگے اس وقت تک پنجاب کی یہ نئی نبوت اپنے شباب تک پہنچ چکی ہوگی مسلمانوں نے نہ اس پرانی نبوت کے خلاف بر وقت آواز اٹھائی اور نہ وہ اب اس نئی نبوت کا کچھ احساس کر رہے ہیں۔ پرانی نبوت کا مدعی بھی شروع میں شریعت محمدی کے احیاء کا مدعی تھا اور مسلمان اسی دھوکہ میں اسکے اصلی عزائم سے بے خبر رہے۔ یہ نئی نبوت بھی نظام شریعت کے قیام کی آڑ میں مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہے اور ملت کو اس کا اس وقت احساس ہوگا جب یہ پوری طرح اپنی جڑیں پکڑ چکے گی۔

یہ نبوت اس پہلی نبوت سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی اس لئے کہ اس نبوت نے اپنی نشر و اشاعت محض نجی طور پر کی تھی لیکن یہ نبوتِ جدیدہ حکومت کا اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ سوچئے کہ اگر زمامِ اقتدار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آجاتے جو یہ کہے کہ صحیح وہ ہے جسے میری نگاہ صحیح کہدے اور غلط وہ جسے میں غلط قرار دیدوں۔ تو کیا اس کے بعد یہاں قرآن اور حدیث کی کوئی حقیقت بھی باقی رہ جائے گی؟

چھوڑیئے طلوع اسلام کو کہ وہ تو ان لوگوں کے نزدیک منکرِ حدیث ہے مگر ہم پوچھتے ہیں حامیانِ حدیث سے کہ کیا اس نظریہ کے بعد ان کی حدیث کی بھی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ طلوعِ اسلام تو اتنا ہی کہتا ہے کہ

Marfat.com

صحیح اور غلط کا معیار قرآن ہے صحیح وہ ہے جسے قرآن صحیح کہدے اور غلط وہ جو اس کے ہاں سے غلط قرار پا جائے لسے تو آپ منکرِ حدیث کہتے ہیں لیکن اس کے برعکس ایک شخص یہ کہتا ہے کہ "تمہارے اپنے معیاروں کے مطابق صحیح قرار دیئے ہوئے احادیث کے مجموعے صحیح نہیں قرار دیئے جا سکتے جب تک ان کی صحت کے متعلق میری بارگاہ سے فتویٰ نہ صادر ہو جائے ان ذخیروں میں سے جس کو میں صحیح کہدوں وہ صحیح ہے اور جسے میں غلط قرار دیدوں وہ غلط ہے" تو اس شخص کو آپ سب سے بڑا حامیِ حدیث اور محی السنۃ قرار دے رہے ہیں۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق

لہٰذا ختمِ نبوت کے محافظین اور حامیانِ حدیث دونوں کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ یہ نیا فتنہ انھیں کہاں تک پہنچائے گا۔ نیز وہ لوگ جو پاکستان میں نظامِ شریعت کے قیام کے متمنی ہیں سوچیں کہ نظامِ شریعت کے قیام کی آڑ میں یہاں کس قسم کی مستبد ڈکٹیٹرشپ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ ڈکٹیٹرشپ جس میں ڈکٹیٹر کا فیصلہ ایک انسانی حکم نہیں ہوگا بلکہ خدا اور رسول کا حکم قرار دیا جائے گا۔ اور جس سے سرتابی دنیا میں پھانسی کے تختے اور آخرت میں نارِ جہنم کی مستوجب ہوگی!

اس ضمن میں علامہ اسلم جیراجپوری نے تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"تعجب ہے کہ مودودی صاحب اسکے سمجھنے سے قاصر رہے کہ وہ دین ہی کیا ہوگا جس کا مدار کسی کے ذوقِ سخن شناسی پر رکھا جاتے۔ یہ تو علم اور عقل سے گری ہوئی خالص شخصیت پرستی ہے۔"

Marfat.com

الہام

(سابقہ مضمون میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ حدیث کو دین قرار دینے کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو اور دوسری وحی غیر متلو۔ محترم سید جعفر شاہ صاحب نے لکھا کہ وحی کی دو قسمیں تو نہیں تھیں لیکن رسول اللہؐ کو وحی کے ساتھ الہام بھی عطا ہوا تھا۔ حضورؐ نے وحی کی تفسیر الہام کی رُو سے کی تھی۔ اس عقیدہ اور وحی متلو اور غیر متلو کے عقیدہ میں صرف لفظی فرق ہے۔ اصل دونوں کی ایک ہے۔ تفصیل اس اجمال کی ذیل کے مضمون میں ملیگی)

مجلہ فیض الاسلام، راولپنڈی میں محترم سید جعفر شاہ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے " وحی سے ہمارا تعلق "۔ محترم شاہ صاحب نے یہ مضمون اشاعت سے پہلے ازراہِ نوازش مجھے دیکھنے کے لئے ارسال فرمایا تھا۔ مضمون محنت اور کاوش سے لکھا گیا تھا لیکن مجھے اس کے بعض مقامات سے اختلاف تھا جن کی طرف میں نے اپنے خط میں محترم شاہ صاحب کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ آیا الہام کی کوئی دینی حیثیت بھی ہے۔ محترم شاہ صاحب نے میرے عریضہ کا جواب بھی مرحمت فرمایا تھا لیکن اس سے میرا اطمینان

Marfat.com

نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک یہ سوال ایسا اہم ہے جس پر ذرا تفصیلی گفتگو ضروری ہے:-

محترم شاہ صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا تھا کہ رسول اللہؐ کو خدا کی طرف سے تین چیزیں عطا ہوئی تھیں:-

(۱) وحی

(۲) الہام۔ اور

(۳) بصیرت

الہام کیا ہے

وحی اور الہام میں اُنھوں نے فرق یہ بتایا تھا کہ وحی میں مفہوم کے ساتھ الفاظ بھی منزّل من اللہ ہوتے ہیں لیکن الہام میں صرف مفہوم خدا کی طرف سے القا کیا جاتا ہے جسے پیغمبر اپنے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ الہام کے متعلق مزید ارشاد تھا کہ وہ اولیاء اللہ کو بھی عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ تھے:-

"اس طرح کے مجرد خیالات عام انسانوں کے دماغ میں ڈالے جاتے ہیں۔ اولیائے مقربین کے دماغوں میں بھی القا کئے جاتے ہیں اور انبیائے مرسلین کے قلوب مطہر پر بھی الہام کئے جاتے ہیں اور وحی کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے۔ اس وحی میں ایک پیغمبر اس طرح ایک ولی کی سطح پر ہوتا ہے جس طرح ایک ولی تکوینی وحی میں مگسِ شہد کی سطح پر ہوتا ہے لیکن اس اشتراک کے باوجود جس

Marfat.com

طرح ایک ولی مگس سے ایک بلند تر وحی کا بھی حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پیغمبر اولیاء سے ایک بالاتر وحی کا بھی مہبط ہوتا ہے.....

یہ (بالاتر) وحی کسی غیر نبی، کسی ولی اور کسی دوسرے مقرب پر نہیں ہوتی۔ وہی وہ فصل ہے جو ایک پیغمبر کو دوسرے اصحاب وحی سے ممتاز کرتی ہے،،...... اسی کو ما انزل اللہ کہا جاتا ہے ما انزل اللہ اور الہام کا سب سے بڑا قرآنی فرق یہ ہے کہ ہر الہام کا دوسروں تک پہنچانا (تبلیغ و ابلاغ) ضروری نہیں۔

اس کا ابلاغ نہ فرائض ولایت میں ہے نہ فرائض رسالت میں داخل ہے...... اس غیر ملفوظ وحی (الہام) کو ماننے بغیر چارہ کار نہیں۔

اس وحی غیر ملفوظ (الہام) کی ضرورت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

احادیث تنزیل نہیں بلکہ یا تو الہام نبوی ہیں یا بصیرت بشری، عقل و فہم سے بڑا درجہ ہے فراست کا اور فراست سے بڑا درجہ ہے بصیرت کا۔ الہام کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں عقل، فراست اور بصیرت کسی کی رسائی نہ ہو۔ احادیث میں الہام نبوی کا حصہ بہت تھوڑا ہے اور معاملات میں تو بہت ہی شاذ ہے۔ عقائد سب کے سب مکمل طور پر تنزیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مناسک کا (جسے عام طور پر عبادت کہتے ہیں) البتہ الہام سے زیادہ تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اخلاق کا تعلق زیادہ تر اور اکثر و بیشتر بصیرت ہی سے ہے۔ باقی رہے معاملات بسو حدود، اُن کی بھی تنزیل ہی نے بتا دی ہے۔ لیکن ان کی تفصیلات کا تعلق سراسر عقل و بصیرت سے ہے۔

یعنی شاہ صاحب کے خیال کے مطابق:۔

Marfat.com

(۱) عقائد سب کے سب وحی خداوندی ہیں۔

(۲) اخلاق کا تعلق پیغمبرانہ فراست سے ہے۔

(۳) معاملات کی "حدود" منزل من اللہ ہیں لیکن ان کی جزئیات کا تعلق عقل و بصیرت سے ہے۔

(۴) عبادات کی تفاصیل کا تعین الہام کے ذریعے کیا گیا ہے۔

یہ اس لئے کہ محترم شاہ صاحب کے الفاظ ہیں:

عقائد گھڑی گھڑی بدلنے والی حقیقت نہیں جو ہر موقعہ پر ترمیم و اضافہ کرنے کے لئے صرف حدود کھینچ دی جائیں اور ضرورت کے مطابق اس میں ردوبدل کی گنجائش رکھی جائے۔ اس لئے عقائد کو مکمل طور پر تنزیل نے اپنے ذمہ لے لیا۔

مناسک (مراسیم اظہارِ عقیدت) کا بھی قریباً یہی حال ہے لیکن اس کی شکل و صورت مختلف ہو سکتی ہے اور بعض مجبوری کے مواقع پر زمان و مکان اور طریق ادا وغیرہ میں ردوبدل کی بھی ضرورت ممکن ہے۔ اس لئے اس کے اصول و ارکانِ ضروریہ تو تنزیل ہی سے متعلق ہیں لیکن کچھ تفصیلات کا تعلق الہام سے ہے اور بعض جزئیات کا تعلق بصیرت و عقل سے بھی ہے۔

اخلاق کی قدریں بھی غیر متبدل ہیں اس لئے تنزیل ہی نے اسے بھی مکمل کر دیا ہے۔ اگر ضرورت داعیہ کچھ جزئی تفصیلات کا مطالبہ کرے تو اس کیلئے الہام کی ضرورت نہیں۔ بصیرت کافی ہے۔

جہاں تک معاملات کا تعلق ہے ان کی حدود تنزیل نے اپنے ذمے لے لی ہیں اور جزئی تفصیل کو بصیرت ہی پر چھوڑ دیا ہے۔

Marfat.com

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک عقائد، اخلاق اور معاملات کا تعلق ہی محترم شاہ صاحب میرے اس مسلک سے متفق ہیں جسے میں ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں البتہ "عبادات" کے متعلق ان کا خیال ہے کہ جو تفاصیل قرآن نے متعین نہیں کیں، رسول اللہؐ نے بذریعہ الہام متعین فرما دیا تھا۔ یعنی وحیِ غیر محفوظ کی رُو سے۔ اتنے حصے میں محترم شاہ صاحب ان حضرات سے متفق ہیں جو وحی کی دو قسمیں تسلیم کرتے ہیں۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو۔ اس باب میں شاہ صاحب اور وہ حضرات ایک ہی مسلک کے پیرو ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ حضرات اخلاق، معاملات اور عبادات، سب کو وحیِ غیر متلو کے دائرہ کے اندر تصور کرتے ہیں لیکن شاہ صاحب اس وحی (الہام) کا دائرہ صرف عبادات تک محدود قرار دیتے ہیں۔ گویا اصولاً دونوں متفق ہیں۔ فرق صرف تفصیلِ اطلاق میں ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہاں تک بھی فرماتے ہیں کہ

> اس الہامی وحی کو اگر حضورؐ نے مثلہٗ معہٗ یعنی مثل تنزیل مع تنزیل فرما دیا ہو تو اس پر حیرت و استعجاب کے اظہار کی خاص ضرورت نہیں۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہو گی کہ "الہامی وحی" وہی کچھ ہے جسے عام طور پر "وحی غیر متلو" یا "وحی خفی" کہا جاتا ہے۔ وحی غیر متلو کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کے

Marfat.com

بعد "وحی الہامی" کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نظر نہیں آتی تھی لیکن چونکہ محترم شاہ صاحب نے الہام کا ذکر چھیڑ کر اس میں اولیاء اللہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس لئے الہام کے متعلق گفتگو ضروری معلوم ہوتی کیونکہ اس سے پہلے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس عنوان پر طلوعِ اسلام میں کچھ نہیں لکھا گیا (اگرچہ معارف القرآن کی دوسری جلد میں وحی کے عنوان کے ذیل میں اس کے متعلق بحث آچکی ہے)

میں نے اپنے خط میں محترم شاہ صاحب کو اس باب میں لکھا تھا،

(۱) اب رہ گیا الہام۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں انبیاء اور اولیاء دونوں شامل ہوتے ہیں سب سے پہلے اس کے لئے قرآنی سند درکار ہے کہ انبیاء اور اولیاء کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کوئی ایسی چیز ہے جسے الہام کہتے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اس الہام کی اتباع بھی ایمان لانے والوں پر واجب ہوتی ہے، اسی طرح جس طرح وحی کی اتباع واجب ہوتی ہے۔ اگر الہام کی اتباع بھی واجب ہوتی ہے تو یہ دین کا جزو ٹھہرا۔ اس لئے اسے، دین کے جزو اول (وحی) کی طرح یقینی طور پر

(۲) محفوظ شکل میں امت کے پاس ہونا چاہیے۔ اور اگر اس الہام کی اتباع واجب نہیں ہوتی تو اس کی حیثیت دین کی نہ رہی۔ لہٰذا اس صورت میں یہ بات خارج از بحث ہوگی کہ الہام کی نوعیت کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا؟

Marfat.com

(۳) اگر اس کی حیثیت دین کی ہوتی ہے تو پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اولیاء کے الہام کی حیثیت بھی دین کی ہونی چاہیے۔ کیونکہ آپ کے خیال کے مطابق الہام میں انبیاء اور اولیاء دونوں شریک ہوتے ہیں اور دونوں کے الہام کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو امت کے لئے ہر ولی کے الہام پر ایمان لانا اور اس کی اتباع کرنا بھی جزو دین قرار پا جائے گا۔

اس کے جواب میں محترم شاہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا:۔

(۱) قرآنی سند۔ حضرت یوکیبذ (حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ) پر خدا ہی کی طرف سے وحی الہامی ہوتی تھی۔ واوحینا الیٰ ام موسیٰ اور ظاہر ہے کہ یوکیبذ نبیہ نہ تھیں۔ حضرت یوسفؑ کے ساتھ بھی قبل از نبوت یہی ہوا تھا[1]۔ اتنی سند وحی الہامی کے لئے کافی ہے اور وحی تنزیل کی طرح اس کا دروازہ بند ہونے کی کوئی سند نہیں

(۲) الہام کی حفاظت۔ ایسی وحی (جو محفوظ کر لی گئی ہو) صرف قرآن میں محفوظ ہے اور اسی کو ہم نے تنزیلی وحی کہا ہے۔ الہامی وحی کو تسلیم کر لینے سے اس میں کوئی فرق نہیں آتا[2]۔ الہامی وحی کو بھی ہم نے زیادہ سے زیادہ فقط عبادات و مناسک میں منحصر کیا ہے

---

[1] ان مثالوں کی تفصیل ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی۔

[2] سوال یہ نہیں تھا کہ وحی الہامی کو تسلیم کر لینے سے وحی تنزیل میں فرق آتا ہے یا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ اگر وحی الہامی دین کا جزو تھی تو اسے بھی وحی تنزیل کی طرح محفوظ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا جواب نہیں دیا گیا۔

Marfat.com

وہ بھی فقط اپنے رجحان کے اظہار کے طور پر[1] ...... معاملات کو خارج از الہام ثابت کرنے کے لئے اتنے مواد موجود ہیں کہ متخاصم کا ٹھہرنا قریباً ناممکن ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہی مورچہ فتح کرنا ہے[2]۔

(۳) اتباعِ الہام۔ انبیاء اور اولیاء دونوں کے الہامی وحی کا سرچشمہ ایک ہونے کے باوجود اس کی حیثیتِ اتباع میں یقیناً فرق رہے گا۔ اس لئے کہ نبی کی نبوت پر ایمان لانا فرض ہے لیکن کسی ولی کی ولایت پر ایمان لانا کوئی جزو دین نہیں مسٹر لیاقت علی خاں اگر قانونِ پاکستان کے مطابق کوئی حکم دیں تو آپ کو ماننا پڑے گا لیکن اگر وہی حکم علامہ سید سلیمان ندوی دیں تو آپ ماننے پر مجبور نہیں ہوں گے۔ حالانکہ دونوں کا حکم یکساں اور دونوں حکموں کا سرچشمہ ایک ہی کتابِ آئین ہوگا[3]۔ یہ ایک الگ چیز ہے کہ رسول کا کوئی حکم الہامی

---

[1] ذاتی رجحان کا دین میں کیا دخل؟ ایک چیز کے متعلق آپ کا دعویٰ ہے کہ اس کی سند قرآن میں موجود ہے۔ رسول اللہؐ نے عبادات کی جزئیات اس کی رو سے متعین فرمائی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ایسی اہم چیز کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے ایسا فقط اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کیا ہے؟

[2] سوال فریق متخاصم کو شکست دینے کا نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے حقیقت کیا ہے؟ اگر کوئی بات قرآن سے ثابت ہو جائے اور اس سے ہمارے بڑے سے بڑے دعوے کی شکست ہو جاتے تو یہ شکست اس فتح سے ہزار درجہ افضل ہو جو ہمیں اس دلیل سے حاصل ہو جاتے جس کی سند قرآن سے ملتی ہو۔

[3] اگر سید صاحب کا حکم ماننا ضروری نہیں ہوگا تو پھر "آئین پاکستان" کے ضمن میں

(باقی صفحہ آئندہ)

Marfat.com

نہ ہو یا اگر ہو تو کسی شخصیت یا کسی زمان و مکان کے ساتھ مختص ہو
یا قابل تاویل ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تھا محترم شاہ صاحب کا وہ جواب جس سے میں مطمئن نہ ہو سکا تھا میرا سوال یہ تھا کہ

(۱) کیا قرآن کی رُو سے الہام کی کوئی دینی حیثیت ہے۔

(۲) کیا رسول اللہؐ کو اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے کوئی اور وحی بھی ملی تھی جسے "الہامی وحی" کہا گیا ہے۔ اگر ملی تھی اور اس کی حیثیت دین کی تھی تو اسے بھی وحی تنزیل کی طرح محفوظ کیوں نہ رکھا گیا۔

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶۶
سید صاحب کا "تذکرہ ہی بے معنی ہے۔ جب ان کی حیثیت ہی کچھ نہیں تو کسی کو اس سے کیا واسطہ کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں!

نیز یہ بھی واضح ہے کہ پاکستان کی رعایا ہونے کی حیثیت سے خود سید صاحب پر بھی لیاقت علی خاں صاحب کے حکم کی تعمیل واجب ہوگی۔ اس صورت میں اگر اللہ تعالیٰ سید صاحب پر کچھ الہام کرتا ہے تو اس الہام سے بالآخر فائدہ کیا جو نہ دوسروں کے ماننے کے لئے ہے اور نہ خود صاحب الہام کے ماننے کے لئے۔ تختۂ مسجد نہ قابل سوختن نہ در خور فروختن۔ پھر اس اللہ میاں کے متعلق کیا سمجھا جاتے جو اس قسم کے الہام القا کرتا ہے جس کا فائدہ نہ صاحبِ الہام کو ہو نہ کسی اور کو۔ بقول غالب

زاہد نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

Marfat.com

(۳) کیا اولیائے کرام کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ اگر ہوتا ہے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

آیئے۔ ان سوالات کے متعلق ہم دیکھیں کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ اس لئے کہ دین کے متعلق جو کچھ پوچھنا ہو اس سے پوچھنا چاہئے جس نے ہمیں دین عطا کیا ہے۔ دین، اللہ نے دیا ہے۔ اس لئے ہمیں اس باب میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اللہ نے جو کچھ کہنا تھا وہ قرآن میں کہہ دیا۔ اس لئے ہمیں دین کے متعلق ہر باب میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ میرا یہی مسلک ہے اور آرزو یہی ہے کہ میں یہی مسلک لے کر اللہ کے سامنے جاؤں ؛

اِلہام

اِلہام، لھم سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا نگل لینا ہے۔ الھم کے معنی ہیں کسی شے کا کسی کے اندر ڈال دینا۔ اِلہام کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ الھم کا لفظ ایک مقام پر آیا ہے جہاں فرمایا:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۷-۸)

(نفسِ انسانی اور وہ قوتیں جو اسے درست رکھتی ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ نے اس کے اندر متشتت ہو کر برباد ہو جانے اور قوانینِ خداوندی

سے ہم آہنگ ہو کر نشوونما پا لینے کی امکانی قوتیں رکھ دی ہیں)

یہ آیات جلیلہ میرے متعدد مضامین میں اتنی مرتبہ دُہرائی جا چکی ہیں کہ اس مقام پر ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ الھمھا کے لفظ کے کیا معنی ہیں۔ اس کے معنی ہیں "خدا نے نفسِ انسانی کے اندر یہ امکانی قوتیں رکھ دیں"۔ عام طور پر اس کے معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ "اللہ نے نفسِ انسانی کو نیکی اور بدی کا علم دیدیا"۔ میں اپنے ایک مضمون میں بتا چکا ہوں[1] کہ یہ معنی بہ وجوہ درست نہیں۔ لیکن اس وقت اس نکتہ کے متعلق بحث نہیں۔ اگر اس کے معنی یہ بھی لئے جائیں تو بھی یہ آیت اس بات کی سند نہیں قرار پا سکتی کہ اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کرام یا اولیاء مقربین کو الہام کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس آیت میں "نفس انسانی" کے الہام کا ذکر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں مومن اور کافر کی بھی تمیز نہیں۔ چہ جائیکہ عام مومن اور انبیاء اور اولیاء کی تخصیص ہو۔ لہٰذا یہ آیت مقصد پیش نظر کے لئے مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔

قرآن میں صرف اسی ایک مقام پر الہام کا ذکر ہے اور اس مقام سے ظاہر ہے کہ یہ وہ الہام نہیں جو حضرات انبیاء کرام کی طرف کیا جاتا ہو

---

[1] دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" کا مجموعہ۔ شائع کردہ طلوعِ اسلام

Marfat.com

قرآن کی رو سے براہِ راست بحث تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے الہام کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن دوسرے انداز سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام اور غیر انبیاء کو الہام ہوتا ہے۔ محترم شاہ صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہی دلیل پیش کی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بعض مقامات پر وحی کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس کے معنی وہ وحی نہیں جو حضرات انبیاء کرام کی طرف نازل ہوتی ہے بلکہ اس کے معنی الہام کے ہیں۔ اب آیئے اس دلیل کی طرف:۔

وحی

لفظ وحی کے معنی ہیں "خفیف لیکن بہت تیز اشارہ"۔ قرآن میں یہ لفظ اشارے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت زکریاؑ کے تذکرے کے سلسلہ میں ہے:۔

فخرج علٰی قومہ من المحراب فاوحی الیھم (۱۹/۱۰)

(وہ محراب سے اپنی قوم کی طرف آیا اور انھیں اشارے سے کہا...

دوسرے مقام پر خبیث فطرت انسانوں کی باہمی خفیہ سازشوں اور اشارات و کنایات سے گفتگوؤں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

وان الشیطین لیوحون الٰی اولیاءھم (۶/۱۲۱ نیز ۶/۱۱۲)

(اور شیاطین اپنے دوستوں سے اشاروں میں خفیہ سازشوں کی باتیں کرتے ہیں)

Marfat.com

جس قانون کی رو سے آفاقی کائنات کا نظم و نسق جاری ہے اس کے لئے بھی وحی کا لفظ آیا ہے۔

اوحی فی کل سماءٍ امرھا (۴۱/۱۲)

(اللہ نے ہر سماء میں اپنا امر وحی کر دیا)

زمین کے متعلق ہے کہ وہ اپنے "اثقال" نکال باہر کرے گی۔

بان ربک اوحی لھا (زلزلت)

(کیونکہ تیرا رب اسے اس کی وحی کرے گا)

شہد کی مکھی کے متعلق بھی ہے کہ خدا نے اسے وحی کی (اوحی ربک الی النحل ، سورہ نحل) کہ وہ کس طرح اپنا چھتہ بنائے اور اسے شہد سے بھر دے۔

جنگ بدر کے سلسلہ میں ملائکہ کے متعلق فرمایا کہ

اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین اٰمنوا (۸/۱۲)

(جب تیرے رب نے ملائکہ کی طرف وحی کی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تم جماعت مومنین کو ثابت قدم رکھنا)

ان مقامات میں وحی کے معنی امر الٰہی کے ہیں۔ کائنات اور نوامیسِ فطرت میں امر الٰہی (امر تکوینی) کس طرح نفاذ پذیر ہوتا ہے ہم اسے نہیں جان سکتے۔ یہ خدا کا قانون ہے جس کی رو سے کارگہ فطرت اس حسن و خوبی سے

Marfat.com

چل رہا ہے ہم اس قانون کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے نتائج کا مشاہدہ کر سکتے ہیں لیکن یہ قانون کس طرح کارفرما ہوتا ہے، اس راز کو نہیں پا سکتے۔

وحی کے متعلق اب دوسری قسم کی مثالیں لیجئے۔ ان آیات میں اس وحی کا ذکر ہے جو خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کی طرف نازل کی جاتی تھی۔ یہ صرف خاصۂ نبوت تھا اور کوئی غیر از نبی اس میں قطعاً شریک نہ تھا۔

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح ..... الخ (۴/۱۶۳)

یقیناً ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح ہم نے نوحؑ کی طرف اور دوسرے انبیاء کی طرف جو اس کے بعد آئے وحی بھیجی تھی۔ اور وحی بھیجی تھی ابراہیمؑ کی طرف اور اسمٰعیلؑ کی طرف۔ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد کی طرف۔ اور عیسٰیؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف۔ اور داؤدؑ کو ہم نے زبور عطا کی تھی....

اس وحی کی خصوصیت یہ تھی کہ خود رسول اس کی اتباع کرتا تھا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے:۔

اتبع ما یوحیٰ الیک (۱۰/۲)

اور جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو۔

Marfat.com

اور اسی وحی کی رو سے نبی اکرمؐ، نوعِ انسانی کو غلط نظامِ زندگی کے نتائج اور عواقب سے آگاہ کرتے تھے۔

قل انما انذرکم بالوحی (۲۱/۴۵)

ان سے کہدو کہ میں تمہیں صرف وحی خداوندی کی رو سے آگاہ کرتا ہوں۔

اسی وحی کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔

واوحی الی ھذا القراٰن لانذرکم بہ ومن بلغ۔ (۶/۱۹)

اور میری طرف اس قرآن کو وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور ان تمام انسانوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے، آگاہ کر دوں۔

حضورؐ کی حیثیتِ رسالت اسی وحی قرآنی کی رو سے تھی۔ اس کے علاوہ باقی حیثیت بشری تھی۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الٰہ واحد (۱۸/۱۰۹)

ان سے کہدو کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اس امتیاز کے ساتھ کہ میری طرف وحی ہوتی ہے کہ تمہارا الٰہ فقط اللہ واحد ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ وحی قرآن کے اندر ہے اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھا ہے۔ لہٰذا یہی وہ ملفوظ اور محفوظ وحی ہے

Marfat.com

جو رسول اللہؐ کی طرف نازل ہوئی اور جس کی اتباع ہر مومن پر لازم ہے یہ یقینی ہے، ظنی نہیں۔ حق ہے، باطل اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ یہی دین ہے اور یہی اللہ کی طرف سے حجت اور سند۔ اس وحی کی کنہ و حقیقت کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ یہ خاصۂ نبوت ہے اور مقامِ نبوت حیطۂ ادراک سے ماوراء ہے۔ معلوم نہیں اس کا نزول انبیائے کرام کی طرف کس طرح ہوتا تھا۔ نبی کے علاوہ کوئی انسان اس حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ اور اب چونکہ نبوت بھی ختم ہو چکی ہے اس لئے ہم وحی کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اور ہمارے لئے زندگی کا ضابطہ۔ قوانینِ فطرت کی طرح اس کی صداقت بھی اس کے نتائج سے مشہود ہو جاتی ہے۔

وحی غیر انبیاء کی طرف

اب وہ تیسری مثال لیجئے جہاں وحی کا لفظ انبیائے کرامؑ کے علاوہ دوسرے انسانوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

(۱) حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق ہے:

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (۵/۱۱۱)

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر

Marfat.com

(۲) یہ قصہ سب کو معلوم ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت پر ان کی والدہ کے دل میں تردد لاحق ہوا کہ اس بچے کے متعلق کیا کیا جائے۔ فرعونی لوگوں کو پتہ چل جانے پر اسے بھی مار دیا جائے گا۔ اس موقعہ پر قرآن میں ہے:-

واذاوحینا الی امك ما یوحی۔ ان اقذفیہ فی التابوت .... الخ (۲۰/۳۸)

(اے موسیٰ) جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی کہ وہ تجھے ایک صندوق میں ڈال دے اور اس صندوق کو دریا میں بہا دے...

(۳) تیسری آیت حضرت یوسفؑ کے متعلق ہے جب ان کے بھائیوں نے انھیں کنوئیں میں ڈال دیا تو قرآن میں ہے:-

واوحینا الیہ لتنبئنہم بامرہم ھذا وھم لا یشعرون۔ .... (۱۲/۱۵)

ہم نے یوسف کی طرف وحی کی تو انھیں ان کی اس کرتوت کے متعلق خبر دے گا درانحالیکہ وہ نہیں سمجھتے ہوں گے۔

یہ ہیں وہ مقامات جن سے محترم شاہ صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے جس میں نبی اور غیر نبی سب شامل ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ الہام تھا جس کی رُو سے رسول اللہؐ عبادات سے متعلق اصولی احکام

Marfat.com

کی جزئیات متعین فرماتے تھے۔ یعنی حضورؐ کی طرف دو قسم کی وحی ہوتی تھی۔

(۱) وہ وحی جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اور

(۱۱) وہ وحی جو قرآن میں نہیں، اسے الہام کہا جائے گا۔

اور یہ "الہامی وحی" اولیائے کرام کی طرف بھی نازل ہوتی ہے لیکن اس کی حیثیت ایک نبی کی "الہامی وحی" کے برابر نہیں ہوتی۔

یہی مقام غور طلب ہے۔

ان مثالوں میں ایک مثال حضرت یوسفؑ کی ہے جو رسول تھے لیکن محترم شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب حضرت یوسفؑ ہنوز شرفِ نبوت سے سرفراز نہیں ہوتے تھے۔ بہرحال، باقی دو مثالیں یقیناً ایسی ہیں جن میں وحی کے لفظ کا استعمال غیر انبیاء کے لئے ہوا ہے۔ لیکن (اس تفصیل میں گئے بغیر کہ اس قسم کے "اشارات"[1] (وحی) سے مفہوم کیا ہے) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس چیز کا دین کے ساتھ کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُمِّ موسیٰ کے دل میں کیا ڈال دیا اور حواریوں سے کیا کہدیا۔

---

[1] ان مقامات میں تو صرف "اشارات" (وحی) کا لفظ آیا ہے۔ قرآن نے فاسقین کے متعلق کہا ہے کہ واذا اردنا ان نھلك قریة امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا ..... (۱۷/۱۵)

"اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو تباہ کر دیں تو اس کے عیش پسند لوگوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ فسق شروع کر دیتے ہیں"۔ اسے کیا کہا جائے گا؟

Marfat.com

اور کس طرح کہہ دیا ؟ نیز یہ کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ رسول اللہؐ کی طرف دو قسم کی وحی ہوا کرتی تھی۔ ایک وہ جو قرآن میں محفوظ ہے اور دوسری وہ جو محفوظ و ملفوظ نہیں، لیکن بایں ہمہ جزو دین ہے۔ اس امر کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ قرآن نے نہ تو رسول اللہؐ کی طرف آنے والی وحی کی دو قسمیں بیان کی ہیں اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ قرآن کے باہر کہیں اور بھی وحی مل سکتی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ جو وحی رسول اللہؐ کی طرف آئی تھی وہ اسی قرآن میں ہے۔ (اوحی الی ھذا القرآن)۔ قرآن ہی وحی کیا گیا تھا۔ (نحن نقص علیک احسن القصص بما اوحینا الیک ھذا القرآن وان کنت من قبلہ لمن الغافلین ۱۲/۳) اس لئے یہ کہنا کہ رسول اللہؐ کی طرف دو قسم کی وحی آئی تھی اور اس میں سے ایک وحی قرآن کے اندر ہے اور دوسری قرآن کے باہر، قرآنی تصریحات کے یکسر خلاف ہے۔ اور اپنے ذہن کی تخلیق، (یا محترم شاہ صاحب کے خود اپنے الفاظ میں، ذاتی رجحان کا نتیجہ)

یہ تفریق کیوں

ذرا سوچئے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت کیا لاحق ہوئی کہ دین کا کچھ حصہ ایک قسم کی وحی کے ذریعے نازل کرے اور کچھ حصہ دوسری قسم کی وحی کے ذریعے جسے روایت پرست حضرات وحی غیر متلو سے تعبیر کرتے ہیں اور محترم شاہ صاحب

Marfat.com

جذبہ جو آج ہمارے اعماق قلب میں بھی غیر شعوری طور پر مچلتا رہتا ہے، اور جس کی رُو سے ہم اپنے تحت الشعور میں سمجھتے ہیں کہ عبادت کو معاملات سے الگ اور بلند رکھنا چاہیئے۔ اور یہی ہے وہ جذبہ جس کے ماتحت محترم شاہ صاحب اخلاق و معاملات کے اصولوں کی جزئیات کی تعیین کے لئے تو بصیرت کو کافی سمجھتے ہیں لیکن عباداتی اصولوں کی تفصیلات کے تعین کے لئے کسی الگ (اور بلند) ذریعے کی تلاش میں ہیں۔

ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ قرآن اخلاق و معاملات و عبادات میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس لئے جو طریق کار اخلاق و معاملات کے قرآنی اصولوں کی جزئیات متعین کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا وہی طریق عبادات کے قرآنی اصولوں کی تفصیلات کی تعیین کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ ان تمام تفاصیل کو نبی اکرمؐ نے اپنی بصیرت کی بنا پر متعین فرمایا تھا۔ بصیرت (جو قرآن کی روشنی میں روبعمل آتے) کوئی ایسی گھٹیا چیز نہیں جسے اخلاق و معاملات سے تو وابستہ کرلیں لیکن اسے عبادات تک لے جانے میں جھجک محسوس کریں۔ آپ تو خود اس کے معترف ہیں کہ

پیغمبر کی بصیرت یا اجتہاد کوئی ایسی معمولی چیز نہیں جسے ہم سرسری نظر سے دیکھ لیا کریں اور اسے معمولی درجہ دیکر ٹال جائیں۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے خود جزئیات متعین نہیں کیں بلکہ اصولی احکام تک اکتفا کیا ہے۔ اس سے مقصود ہی یہ تھا کہ وہ اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں لیکن ان کی جزئیات میں مختلف زمانوں کے تقاضوں کے پیش نظر رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اگر ان جزئیات کو بھی قیامت تک کے لئے (قرآنی اصولوں کی طرح) غیر متبدل رہنا ہوتا تو ان کا تعین خود وحی کے ذریعے (قرآن کے اندر) کر دیا جاتا۔ ان جزئیات کا تعین قرآنی اصولوں کی روشنی میں انسانی بصیرت پر چھوڑا گیا ہے۔ یہی رسول اللہؐ نے کیا تھا اور یہی حضورؐ کے بعد کیا جائے گا۔ ایسا کرنے کا نام سنّت رسول اللہ کی اتباع ہے۔

اولیاء کا الہام

باقی رہا اولیاء کرام کی طرف الہامِ خداوندی سو اس کی سند قرآن سے کہیں نہیں ملتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اولیاء کرام کا جو تصور ہمارے ہاں عام ہے وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے۔ قرآن کی رو سے ہر مومن ولی اللہ ہے یعنی ولی اللہ (خدا کا مطیع فرمانبردار) ہونا مومن کی خصوصیت یا صفت ہے۔ جس طرح ہر مومن صادق (سچا) ہوتا ہے اسی طرح ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ مومنین میں سے ایک خاص طبقہ اولیاء اللہ کا ہوتا ہے۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں وہ مومنین ہیں اور اس خصوصیت کے اعتبار سے اولیاء

Marfat.com

جو لوگ غیر خدائی قانون کی اتباع کرتے ہیں وہ کافرین ہیں اور اس خصوصیت کے اعتبار سے اولیاء الشیطان، قرآن نے اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی اصطلاحات کا استعمال انہی معنوں میں کیا ہے۔ مومنین میں سے کسی الگ طبقہ کا نام اولیاء اللہ نہیں رکھا۔

اصل یہ ہے کہ ولایت کا تصور بھی "عجمی اسلام" کا پیدا کردہ ہے اور اسلام کے خلاف اسی سازش کا نتیجہ جس کا ذکر ان صفحات میں کئی بار آچکا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن سے دُور رکھنے کے لئے جو سازش کی گئی اس کی پہلی کڑی یہ عقیدہ پیدا کرنا تھا کہ رسول اللہؐ کو اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے، ایک اور وحی بھی دی گئی تھی جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کے ہم پایہ (مثلہ معہ) ہے۔ یہ وحی روایات میں ملتی ہے، اس لئے روایات عینِ دین ہیں۔ یہ عقیدہ پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی روایات سازی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے روایات کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ حالانکہ روایات کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہؐ نے امت کو دیا تھا نہ خلفائے راشدینؓ نے مرتب کیا تھا۔ اس طرح اُس دین کے مقابل جو اللہ نے دیا تھا، ایک اور "دین" مدون کر کے رکھ دیا اور اسے اتباعِ سنت رسول اللہ قرار دے کر امت کو اس میں اُلجھا دیا۔

لیکن جب روایات کے مجموعے مرتب ہو گئے تو مزید "دین سازی کی

Marfat.com

گنجائش نہ رہی اب اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان عقل و بصیرت سے کام نہ شروع کر دے. اس کے لئے الہام کا عقیدہ تراشا گیا اور اس تصور کو عام کیا گیا کہ الہام چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے ملتا ہے اس لئے اس کا درجہ عقل و بصیرت سے بہت اونچا ہے. اب روایات کی بجائے اولیاء اللہ کے ملفوظات مرتب ہونے شروع ہو گئے اور اس طرح ایک تیسرا متوازی Parallel "دین" پیدا ہو گیا. روایات کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ قرآن کی ناسخ ہیں (اور دلیل یہ تھی کہ قرآن کا جو مفہوم رسول اللہؐ سمجھ سکتے تھے وہ دوسرے مسلمان کس طرح سمجھ سکتے ہیں) اب یہ "الہامات" قرآن اور روایات دونوں کے ناسخ قرار پا گئے. اس دلیل کے ساتھ کہ دین کا یہ مفہوم براہ راست اللہ اور اس کے رسول کا سمجھایا ہوا ہے. اس لئے قرآن کے الفاظ میں جانے کی ضرورت نہیں. ان الفاظ کا باطنی مفہوم بالکل ظاہر سے الگ ہے اور اس کا ذریعہ علم سینہ بہ سینہ "علم لدنی" ہے. لیجئے. معاملہ صاف ہو گیا. روایات کے لئے تو پھر بھی دو چار راویوں کا نام لینا پڑتا تھا الہامی ملفوظات کے لئے اس کی بھی ضرورت نہ رہی. روایات کے لئے اگر رسول اللہؐ کے اسم گرامی کی طرف نسبت وجہ کشش تھی تو "الہامات" کے لئے اس سے بھی بڑی کشش، کشف و کرامات کا وجود تھا. اس کشش و دلیل کے سامنے کوئی اور جاذبیت و برہان کام نہیں دے سکتی تھی. نتیجہ یہ ہوا

Marfat.com

الہامات کے یہ آستانے دھڑا دھڑ کعبۂ مقصود بننے شروع ہو گئے اور صرف یہ کہ یہ کشش صاحبان کشف والہام کی زندگی تک ہی محدود رہی بلکہ ان کے مرنے کے بعد ان کے مزارات سے لپٹ گئی۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔

یہ اُمت خُرافات میں کھو گئی

وحی کا دروازہ قرآن سے بند ہو گیا تھا۔ روایات سازی، احادیث کے مجموعے مرتب ہو جانے کے بعد ختم ہو گئی لیکن الہام کا دروازہ قیامت تک کے لئے کھلا ہے۔ بقول محترم شاہ صاحب

"وحی تنزیل کی طرح اس کا دروازہ بند ہونے کی کوئی سند نہیں"

میں اس وقت اس بحث میں نہیں جانا چاہتا کہ کشف و کرامات کی حقیقت کیا ہوتی ہے (کیونکہ بعض لوگوں سے جو خلاف عادات امور صادر ہوتے ہیں ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا[1]) اس لئے کہ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔ موضوعِ زیر نظر کے سلسلہ میں کہنا صرف یہ ہے کہ

(۱) قرآن کی رُو سے الہام کی کوئی دینی حیثیت نہیں، نہ جہاں تک

---

[1] اس وقت اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ خارقِ عادات امور کا ظہور صرف مسلمان بزرگوں ہی کی طرف سے نہیں ہوتا ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ یہ ایک فنی چیز ہے جسے دین سے کوئی علاقہ نہیں۔ ان امور کی تفصیل کے لئے میری تصنیف "معارف القرآن" ملاحظہ فرمائیے۔

Marfat.com

...اللہ کا تعلق ہے، نہ حضورؐ کے بعد۔

(۲) جہاں تک دین کا تعلق ہے وحی کی صرف ایک ہی قسم ہے جو حضرات انبیاء کرام کو ملتی تھی اور جس کی آخری صورت قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ حضورؐ کے بعد کوئی اس وحی سے سرفراز نہیں ہو سکتا۔ جو اس کا مدعی ہو وہ قرآن کے کھلے الفاظ میں مفتری علی اللہ ہے۔

(۳) قرآن کے ساتھ انسان کو بصیرت عطا ہوتی ہے۔ اس لئے جن امور کی تفصیل قرآن نے خود بیان نہیں کی، ان کی تفصیل قرآنی اصولوں کی روشنی میں از روئے بصیرت متعین کی جائے گی۔ یہی رسول اللہ نے کیا اور ہمارے لئے بھی ایسا کرنا منشائے قرآنی اور سنت رسول اللہ کے عین مطابق ہے۔ اس باب میں اخلاق، معاملات اور عبادات میں کوئی تفریق و تخصیص نہیں۔ اگر تفریق مقصود ہوتی تو عبادات کی جزئیات قرآن خود ہی متعین کر دیتا۔ وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔ (اللہ کے لئے یہ بہت آسان تھا)۔

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ (اعراف)

مقام حدیث

حدیث کی دینی حیثیت کیا ہے؟ حدیثیں کس طرح بنیں اور کس طرح ہم تک پہنچیں؟ حدیثوں کے سامنے قرآن کی پوزیشن کیا رہ گئی ہے؟ ان تمام مباحث پر تفصیلی گفتگو اور جامع معلومات۔ دو جلدوں میں۔

جلد اوّل

شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام ۔ کراچی

قیمت مجلد ــــ چار روپئے

Marfat.com